لاہور سے
چین تک
اسلم کمال

اسلم کمال

مقبول اکیڈمی

۱۰- دیال سنگھ مینشن، شاہراہِ قائدِاعظم، لاہور

بار اوّل ——— سنہ ۱۹۸۹ء
اہتمام ——— ملک مقبول احمد
مطبع ——— ناصر پرنٹرز، لاہور

مقبول اکیڈمی لاہور

شوروم: ۱۰ دیال سنگھ مینشن، شاہراہِ قائدِ اعظم، لاہور
سیلز آفس: ۱۹۹، سرکلر روڈ، چوک انارکلی، لاہور

جسکا نقشِ کفِ پا جنت نما ہے

ہمالہ کے چشمے اُبلنے لگے

۱

مَیں ان اوراق میں جغرافیہ کا طالبِ علم نہیں ہوں۔
شاعر ہوں۔ حُسن پرست ہوں۔
مَیں مورّخ نہیں ہوں، محقق تو بالکل نہیں۔
مصوّر ہوں، خطّاط ہوں۔
مَیں مُلکِ چین تعصبات لے کر نہیں گیا کہ حکمت کی بات مومن کی گُم شدہ میراث ہے۔

اور مرعوبیت میری سرشت میں نہیں ہے۔ مَیں پاکستانی ہوں۔

یہ رُوداد اُن لمحوں کے شمار کا تسلسل ہے جو ڈوبتے اُبھرتے رہے۔ اس کہکشاں میں کبھی کوئی ستارہ چمک کر نیا اُفق روشن کرتا ہے۔ اور کوئی ٹوٹ کر لمبی لکیر کھینچتا ہوا سفرِ معکوس میں گُم ہو جاتا ہے۔ ذہن کی ایک ایک لہر اور قلب کی تمام واردات اس تسلسل کی کڑیاں ہیں کہ سب منظر میری آنکھوں کے عدسوں میں اپنی نوعیت کے اعتبار سے پھیلے اور سمٹے ہیں۔ قُرب و بُعد کی انتہائیں ہمیشہ وراۓ ارتکاز رہتی ہیں۔ صرف آئینہ وجدان پر اِک عکس اُبھرتا ہے۔

ایک سالم انسان کے سفر میں مرئی اور غیر مرئی ہر دو صورتیں یکساں اہمیت رکھتی ہیں۔ ممکن ہے کہ ان اوراق میں کوئی سفرنامہ نہ ہو اسی لیے مَیں اسے سفرنامہ نہیں کہتا —— مگر یہ ایک سفرنامہ ہے کہ ننھے ولید کمال کی مسکراہٹ اور اسکی ماں پروین کمال کے چہرے کا اعتماد اپنے گھر کے آنگن میں سرما کی پہلی بارش کی بوندوں میں چھوڑ کر گیارہ نومبر ۱۹۸۱ء بعد از دوپہر لاہور ائرپورٹ پر ارشاد صدیقی، خالد بٹ، فہیم کمال اور سعدیہ کمال کو خُدا حافظ کہہ کر کراچی کے لیے پرواز کر گیا تھا۔

کراچی ائرپورٹ پر اُترا تو سعدیہ کمال یاد آئی۔

"ابّو اپنے ساتھ ٹھنڈے پانی کا تھرماس رکھ لیں۔"

کراچی میں چند دوستوں کو آمد کی اطلاع دے سکا۔ بہت سارے ملنے آتے۔ محبت بھری باتیں اور لطیفے بازی ہوتی رہی۔ ساڑھے گیارہ بجے شب حُریّت والے سجاد میر پہنچے۔ دیر بعد ملے تھے۔ ڈروے ہوٹل کے ایپل رُوم میں فریش لائم پیتے رہے بیتے دنوں کو یاد کرتے رہے پھر میرؔ صاحب چلے گئے اور نیند آگئی۔

۱۲ دسمبر کی صُبح مڈوے ہوٹل کراچی کے کمرہ نمبر ۲۷ میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ریسیور اُٹھایا۔

"سَر آپ جاگ جایئے۔ آپ کی فلائیٹ ۴/۱ ۵ بجے ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" مَیں نے جواب دیا۔ اور دانت صاف کر کے شیو کیا۔ نہانے کی تیاری کر رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہُوئی۔

"آجاؤ۔"

بیرا اندر داخل ہُوا اور پُوچھا۔ "سر چائے یا کافی؟"

"کافی۔" مَیں نے کہا اور بیرا چلا گیا۔

نہا کر جلدی جلدی کپڑے پہنے اور ایک سیب اور دو کیلے جلدی جلدی نگل کر کافی پی سگریٹ سُلگایا اور دوبارہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

"سَر سب تیار ہیں اور لاؤنج میں آ چکے ہیں۔ آپ کا انتظار ہے۔ پورٹر کو سامان دیجئے اور آ جایئے۔" باہر آیا اور آغا ناصر سے السلام علیکم ہُوئی۔ پھر ائرپورٹ پہنچے اور وی آئی پی لاؤنج میں ارباب نیاز اور بیگم ارباب نیاز سے مُلاقات ہُوئی۔ سگریٹ سُلگایا تو پتہ چلا تین رُکنی وفد

یں سگریٹ نوش مَیں اکیلا ہوں ۔ صُبح صادق کے نُور میں جہاز پر سوار ہُوتے اور جہاز رن وے پر دوڑ کر فضا میں بُلند ہو گیا ۔ اور کراچی شہر کا ایک خوُب صُورت چکّر کاٹا ۔

FROM KARACHI
P.K. FLIGHT
NO: 750 READY
TO LEAVE FOR
PEKING

۳

سُورج ابھی طلوع نہیں ہُوا۔ اور کراچی کا عظیم شہر ابھی انگڑائی لے
رہا ہے اور منوڑا کے ساحل پر ہلکی ہلکی لہریں ساحل کو تھپتھپا رہی ہیں۔
منوڑا اسی سائیٹ پر پہلے ایک مندر تھا۔ اب برائے نام رہ گیا ہے۔ اس
کے مغرب میں پی این ایس ہمالیہ کی جانب ایک قبرستان ہے۔ جہاں تک
لوگ دن کے اُجالے میں بھی کم جاتے ہیں۔ مَیں راتوں کی تنہائیوں میں اِس
جگہ بیٹھتا تھا۔ یہ راتیں ماضی بعید کا قِصّہ ہیں۔ مگر میرے حافظے میں اس کی تمام
تفصیل پوری کیفیات کے ساتھ موجود ہے۔ میرے پاس کرکٹ کا ایک بیٹ
ہوتا تھا۔ جسے مَیں کالج کے بعد اپنے ساتھ ساتھ لیے پھرتا تھا۔ فُرصتوں کی تلاش
میں۔ اس وقت کے اِنتظار میں کہ مَیں دوبارہ نیٹ پریکٹس کرسکوں۔ مگر جب
وقت کے تسلسل میں کہیں بھی کوئی رخنہ کوئی وقفہ دُور دُور تک دکھائی نہ دیا۔
تو مَیں نے ایک رات وہ بیٹ چُپکے سے سمندر کی لہروں کے سپرد کردیا یہ
رات پورے چاند کی رات تھی۔ سمندر کف اُڑا رہا تھا۔ چاروں طرف دُھند تھی۔
میرا بلّا موجوں میں اُبھرتا ڈوبتا غائب ہو جاتا اور پھر کسی لہر کی اُنگلی پکڑے
ضِدّی بچّے کی طرح میری طرف لوٹ آتا —— مَیں نے اِس منظر سے نظر میں

ہٹانے کے لیے بھی اور ضدّی بچّے کی آس توڑنے کے لیے بھی ایک لکڑی کے ٹکڑے کو قلم کی طرح پکڑ کر تازہ تازہ، ہموار ریت پر لکیریں کھینچنی شروع کر دیں۔ وہ لکیریں باہم ملتی، بچھڑتی ایک دوسرے کو کاٹتی بناتی رہیں اور مَیں ہجر و وصال کے اِس کھیل کی دلفریبی میں گُم ہوتا گیا۔

سمندر کی لہریں آتیں اور میرے نقش چاٹ کر واپس پلٹ جاتیں اور مَیں لہروں کے لوٹتے ہی نرم تازہ ہموار ریت پر پھر کوئی نقش بناتا۔ بڑی سُرعت سے کہ مبادا لہر آجاتے اور مَیں اپنا نقش مکمّل بھی نہ کر سکوں اور وہ میرا ادھورا نامکمّل نقش نِگل لے۔ نہ جانے کون میرے کان میں کہتا ہاں نقش ہر صُورت میں لہر کی آمد سے پہلے مکمّل کر لینا۔ ادھورا نقش کچھ نہیں ہوتا اور لہریں صرف ادھورے نقش نِگل سکتی ہیں۔ یہ ایک فنّی مراقبہ تھا یا رُوحانی چلّہ یا صرف کرکٹ کا کھیل تھا۔ مَیں نقش بناتا تھا یا رنز ——— اَن گِنت رائنس بے شمار لہریں ——— لاتعداد نقش ——— کبھی کبھی کھیلتے کھیلتے رات گزر جاتی تھی۔ ساحل کے پتھروں پر بیٹھ کر سوچتا تھا۔ سمندر نے جو میرے نقش چاٹ لیے کبھی تو ساحل پر بھی بکھیریں گے تو کیسے موتی ہوں گے۔

"خواتین و حضرات السلام علیکم۔ جہاز کا کیپٹن آپ کو خوش آمدید کہتا ہے۔ ہم چھتیس ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرتے ہُوئے نواب شاہ، رحیم یار خاں، اسلام آباد اور گلگت پر سے گُزرتے ہُوئے، قراقرم عبور کرتے ہُوئے چین میں داخل ہوں گے یہ پرواز مسلسل ساڑھے چھ گھنٹے کی ہے۔ اُمید ہے آپ کا یہ سفر ہمارے ساتھ نہایت خوشگوار گزرے گا۔"

سُورج ابھی طلوع نہیں ہُوا اور مشرق میں پورا چاند دکھائی دیتا ہے۔ جہاز میں ابھی کافی ٹھنڈ ہے۔ ائرہوسٹس نے سُرخ کمبل مسافروں میں تقسیم

لیے ۔ مَیں نے کمبل ٹانگوں پر پھیلا لیا ۔ جہاز میں تقریباً پینتیس مسافر خواتین و حضرات ہیں ۔ میرے مقابل والی سیٹ پر ایک نوجوان جاپانی لڑکی کمبل اوڑھ کر لیٹ گئی ۔ بیمار لگتی تھی ۔ ایک نوجوان بارِیش جاپانی کیمرہ لیے جہاز میں اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا ہے ۔ ایک بوڑھا امریکی آدھے بازو کی بُشرٹ میں اپنے ڈنڈ دکھاتا پھرتا ہے اور ہیلو کہہ کر ہر کسی سے گپ بازی شروع کر دیتا ہے ۔ مخالف سیٹ پر بیمار نوجوان جاپانی لڑکی کے چہرے سے وہ کمبل ہٹاتا ہے ۔ اُسے ہیلو ہیلو کرتا ہے ۔ طبیعت کا حال پُوچھتا ہے اور اُس کے سُرخ گال پر بوسہ دے کر آگے بڑھ جاتا ہے ۔ میری اگلی سیٹ پر بوڑھی میم نے سگریٹ سُلگا لیا اور لمبے لمبے کش لیتی ہے اور یوں دھواں باہر اُڑاتی کہ خواہ مخواہ تشویش ہوتی کہ اس بڑھیا کی صحت سگریٹ کے لیے سخت مضر ہے ۔

اِس جہاز میں چار اسٹیورڈ ہیں ۔ چاروں پاکستانی اور ان میں سے ایک چینی زبان بھی جانتا ہے ۔ تین ائرہوسٹس ہیں ۔ دو پاکستانی اور ایک چینی ۔ انھوں نے ناشتہ لگا دیا ہے ۔ مَیں نے سلائس پر مکھن لگایا ۔ اور باہر کھڑکی سے پہاڑوں میں ایک جھیل دکھائی دی ۔ مَیں نے غور کیا ۔ تو مجھے یُوں لگا ۔ جیسے ہم تربیلا ڈیم پر سے گزُر رہے ہیں ۔ مَیں نے چینی ہوسٹس سے پُوچھا ۔ پہلے تو اس نے کھڑکی سے جھانکا مگر شاید کچھ سمجھ نہ آیا ۔ تو جا کر نقشہ اُٹھا لائی اور وہ مقام بتایا نقشہ پر جس پر سے ہم گزر رہے تھے ۔ یہ واقعی تربیلا ڈیم کی جھیل تھی ۔ چند ماہ قبل واپڈا نے مجھے اس کی سیر کی دعوت دی تھی ۔ اس بجلی گھر میں خطاطی کروانے کا فیصلہ کیا تھا ۔ خُدا اِس ڈیم کو سلامت رکھے ۔ انسانی سعئ مشکور فرمائے ۔ اس کی زیرِ تعمیر ٹنل دیکھ کر بے ساختہ یاد آتا ہے ۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم

اور تربیلا کی جھیل اِس بُلندی سے ایک بڑا ایاغ ہی دکھائی دیتی ہے۔ مَیں نے ہوسٹس کے لیے پھر گھنٹی بجائی تو پاکستانی لڑکی آئی جسے مَیں نے لیٹر پیڈ کے لیے کہا۔ وہ پی۔ آئی۔ اے کا خوبصورت پیڈ لے آئی تو مَیں نے لکھا۔

"برادرم کیپٹن صاحب! السّلام علیکم!
اُمّید ہے آج بھی آپ کی یہ پرواز لاجواب ہو گی۔ وہ اس طرح کہ راہ کے قابلِ ذکر مقامات کا تعارف آپ ضرور کروائیں گے۔
مزید اُمّید یہ ہے کہ آج بھی حسبِ معمول آپ کے ساتھ باکمال لوگ محوِ پرواز ہوں گے۔ مَیں صرف اسلم کمال ہوں۔"

یہ خط مَیں نے لفافہ میں ملفوف کر کے ہوسٹس کے سپُرد کیا۔ وہ پہلے تو قدرے گھبرائی پھر شرمائی بھی۔ تب مَیں نے تسلّی کے انداز میں عرض کیا۔
میرا یہ نامۂ محبت تُمھارے کیپٹن کے لیے ہے اور اس میں آپ کی اور آپ جیسی کسی اور کی کوئی شکایت وغیرہ نہیں ہے۔ وہ چلی گئی اور تھوڑی دیر بعد مُسکراتی ہوئی آئی اور بولی۔
"کیپتان آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور آپ کو مایوس نہیں کریں گے۔" ہوسٹس نے یہ کہہ کر میرے ساتھ کی سیٹ پر بیٹھنے کی اجازت چاہی۔
"جی آپ کا اپنا جہاز ہے۔ جہاں جی چاہے بیٹھئے۔ ویسے گرم چائے کا ایک کپ لا دیں تو برف زاروں پر پرواز کا لطف دو بالا ہو

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم

اور تربیلا کی جھیل اِس بُلندی سے ایک بڑا ایاغ ہی دکھائی دیتی ہے۔ مَیں نے ہوسٹس کے لیے پھر گھنٹی بجائی تو پاکستانی لڑکی آئی جسے مَیں نے لیٹر پیڈ کے لیے کہا۔ وہ پی۔آئی۔ اے کا خوبصورت پیڈ لے آئی تو مَیں نے لکھا۔

" برادرم کیپٹن صاحب ! السّلام علیکم !
اُمّید ہے آج بھی آپ کی یہ پرواز لاجواب ہو گی۔ وہ اس طرح
کہ راہ کے قابلِ ذکر مقامات کا تعارف آپ ضرور کروائیں گے۔
مزید اُمّید یہ ہے کہ آج بھی حسبِ معمول آپ کے ساتھ باکمال
لوگ محوِ پرواز ہوں گے۔ مَیں صرف اسلم کمال ہوں "

یہ خط مَیں نے لفافہ میں ملفوف کر کے ہوسٹس کے سپُرد کیا۔ وہ پہلے تو قدرے گھبرائی پھر شرمائی بھی۔ تب مَیں نے تسلّی کے انداز میں عرض کیا۔
میرا یہ نامۂ محبت تُمھارے کیپٹن کے لیے ہے اور اس میں آپ کی اور آپ جیسی کسی اور کی کوئی شکایت وغیرہ نہیں ہے۔ وہ چلی گئی اور تھوڑی دیر بعد مُسکراتی ہوئی آئی اور بولی۔
" کپتان آپ کا شکریہ اَدا کرتے ہیں اور آپ کو مایُوس نہیں کریں گے۔" ہوسٹس نے یہ کہہ کر میرے ساتھ کی سیٹ پر بیٹھنے کی اجازت چاہی۔
" جی آپ کا اپنا جہاز ہے۔ جہاں جی چاہے بیٹھئے۔ ویسے گرم چائے کا ایک کپ لادیں تو برف زاروں پر پرواز کا لطف دو بالا ہو

جائے گا۔"

"جی کیوں نہیں مَیں ابھی لاتی ہوں۔"

اور پھر گرم چائے کا کپ آ گیا۔ مَیں نے ایک گھونٹ لیا اور سگریٹ سُلگا لیا۔

"خواتین و حضرات جہاز کا کیپٹن آپ کی توجّہ چاہتا ہے اور مُبارکباد دیتا ہے۔ آج اِس فلائٹ کے مسافروں کو اتنا خوشگوار اور صاف موسم اِس روٹ پر پرواز کرنے والے مسافروں میں کبھی کبھی کچھ کے مقدّر میں ہوتا ہے۔ خواتین و حضرات بائیں کھڑکی سے دیکھئے نیچے دُنیا کی پانچویں بُلند ترین چوٹی راکاپوشی ہے۔"

راکاپوشی سَر اُٹھائے آسمان کی جانب نگراں ہے۔ راکاپوشی کا منظر دیدنی ہے۔ برف زاروں کی جوّالا راکاپوشی۔ زمستان کا شعلہ راکاپوشی —— نُور ہی نُور راکاپوشی حُسن تمکنت اور تقدّس کا پہاڑ اور پہاڑوں کی دُلہن —— راکاپوشی۔ ہم جس کے سر پر گزر رہے ہیں مگر یوں لگتا ہے۔ پستی اور بُلندی نے اپنے مفہوم ایک دوسرے سے بدل لیے ہیں۔ راکاپوشی آسمانوں سے اُتر رہی ہے اور ہم زمین پر سر اُٹھائے اُسے نازل ہوتا دیکھ رہے ہیں۔ احساس ہوتا ہے کہ آنکھ کتنی حریص، دِل کتنا غریب اور رُوح کس قدر پیاسی ہے کہ ایک پلک جھپکنے کا جُرم زندگی بھر کی خلش بن سکتا ہے۔ مَیں کھڑکی سے چپک کر اِس منظر کی آخری کِرن بھی حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ یہ جذبات کی تہذیب اور احساسات کی تزئین کا موقعہ ہے۔ قلب کی تسکین اور رُوح کی بالیدگی کا موقعہ ہے۔ فِکر و وجدان کی آرائش و زیبائش کریں کہ شعُور کی افزائش کا سامان سمیٹنے کا موقعہ ہے —— جی چاہتا ہے یہ نُور یہ

حرارت یہ روشنی یہ نکھار یہ حُسن یہ تقدس یہ رفعت یہ وقار سب کچھ کشکولِ دل میں اُتر آئے کہ زندگی مضمحل صُبحوں اُداس شاموں اور تاریک راتوں کا سفر ہے۔

" خواتین و حضرات دائیں کھڑکی سے آپ نانگا پربت چوتھی بُلند ترین چوٹی دیکھ سکتے ہیں۔ ہم اِس چوٹی سے ۳۰ کلومیٹر کے فاصلے سے گزُر رہے ہیں۔ اُمیّد ہے یہ منظر آپ کو پسند آئے گا۔"

مَیں اُٹھ کر دائیں کھڑکی میں ایک خالی سیٹ پر بیٹھ کر نانگا پربت کا نظارہ کرتا ہوں۔ بادلوں کا ایک مہیب ٹکڑا نانگا پربت کی جانب بڑھ رہا ہے۔ یوں لگتا ہے کوئی رقیب ہے۔ جل گیا ہے۔ نانگا پربت کو ڈھانپ لینا چاہتا ہے اور نانگا پربت کی جلوہ سامانیاں صرف اپنے لیے محدُود رکھنا چاہتا ہے۔ مگر ہم نے نانگا پربت کی مُسکراہٹ آئینۂ دِل میں اُتار لی ہے۔

" خواتین و حضرات دائیں جانب دیکھیے دُنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی کے ٹو آپ کو دعوتِ نظارہ دیتی ہے۔ ہم کے۔ٹو سے تقریباً ۵۰ کلومیٹر کے فاصلے پر سے گزُر رہے ہیں۔"

نیچے شاہراہِ ریشم ـــــ پاک سرزمین ختم اور چینی علاقہ شروع ہوتا ہے۔ جاپانی بیمار لڑکی نے کمبل اُتار کر رکھا اور بیگ سے کیمرہ نکالا اور میری طرف بڑھایا اور کچھ کہا۔ جو مَیں فوراً سمجھ گیا۔ اور اُس کے کیمرے میں کے ٹو کا عکس اُتار کر کیمرہ اُسے واپس دیا۔ پھر کے ٹو کو دیکھنے لگا کے ٹو مونٹ ایورسٹ سے تین سو فٹ کم بُلند ہے۔ اس طرح یہ دُنیا کی دوسری

بلند ترین چوٹی ہے۔ کیپٹن ٹی جے منٹگمری نے کوہستانِ قراقرم کا جائزہ لیتے وقت مختلف چوٹیوں کو ظاہر کرنے کے لیے کے ون، کے ٹو اور کے تھری کے الفاظ استعمال کیے تھے۔ حرف "کے" برائے قراقرم ہے۔ باقی چوٹیاں دوسرے ناموں سے معروف ہیں۔ مگر "کے ٹو" کے لیے کوئی اور نام زبانِ زدِ عام نہ ہو سکا۔ جبکہ مقامی زبان میں کے ٹو کو چاگوری کے نام سے پکارتے ہیں۔ چاگوری کا مطلب پہاڑوں کا بادشاہ ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ رعب دبدبہ اور شکوہ اس چوٹی کا دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ تاحدِ نظر برف پوش اُونچے نیچے پہاڑوں کے درمیان کے ٹو کی عموداً اٹھتی ہوئی چوٹی انسانی آنکھ کو عظمت کے ایک نئے تناظر سے روشناس کرتی ہے جو بسیط تنہائی سے اُبھرتا ہے۔ بادشاہ شہنشاہ تو اِن بلندیوں کے دامن اور پستیوں میں رعب اور دبدبہ کی سلطنت قائم کرتے ہیں۔ کے ٹو کی رفعت عظمت اور تنہائی کو دیکھ کر پیغمبر یاد آتے ہیں۔ اس کے قریب ابھی کوئی بادل یا ابر پارہ نہیں۔ کے ٹو برف زاروں میں اُداس پُروقار ازل اور اَبد کی تنہائیاں پہنے ہوتے ہے۔ ہمارے نیچے برف میں ایک لکیر شاہراہِ ریشم ــــ انسانی عزم و ہمت کا بے مثال کارنامہ ــــ میری نظریں پھر کے ٹو کی طرف لپکتی ہیں۔ میں اس منظر کو کھونا نہیں چاہتا۔ مگر سفر کی ایک اپنی روش ہے۔ مناظر گزرتے جاتے ہیں۔

"خواتین و حضرات! اس وقت ہم چین کے صُوبہ سنکیانگ کے دارالحکومت اورمچی پر سے گزر رہے ہیں۔ چینی وقت کے مطابق اپنی گھڑیوں میں تین گھنٹے وقت آگے کر لیجیے۔"

سنکیانگ جہاں چینی مسلمانوں کی کثیر آبادی ہے۔

مسجدوں کی بڑی تعداد ہے۔

پاک چین دوستی زندہ باد
ASLAM KAMAL
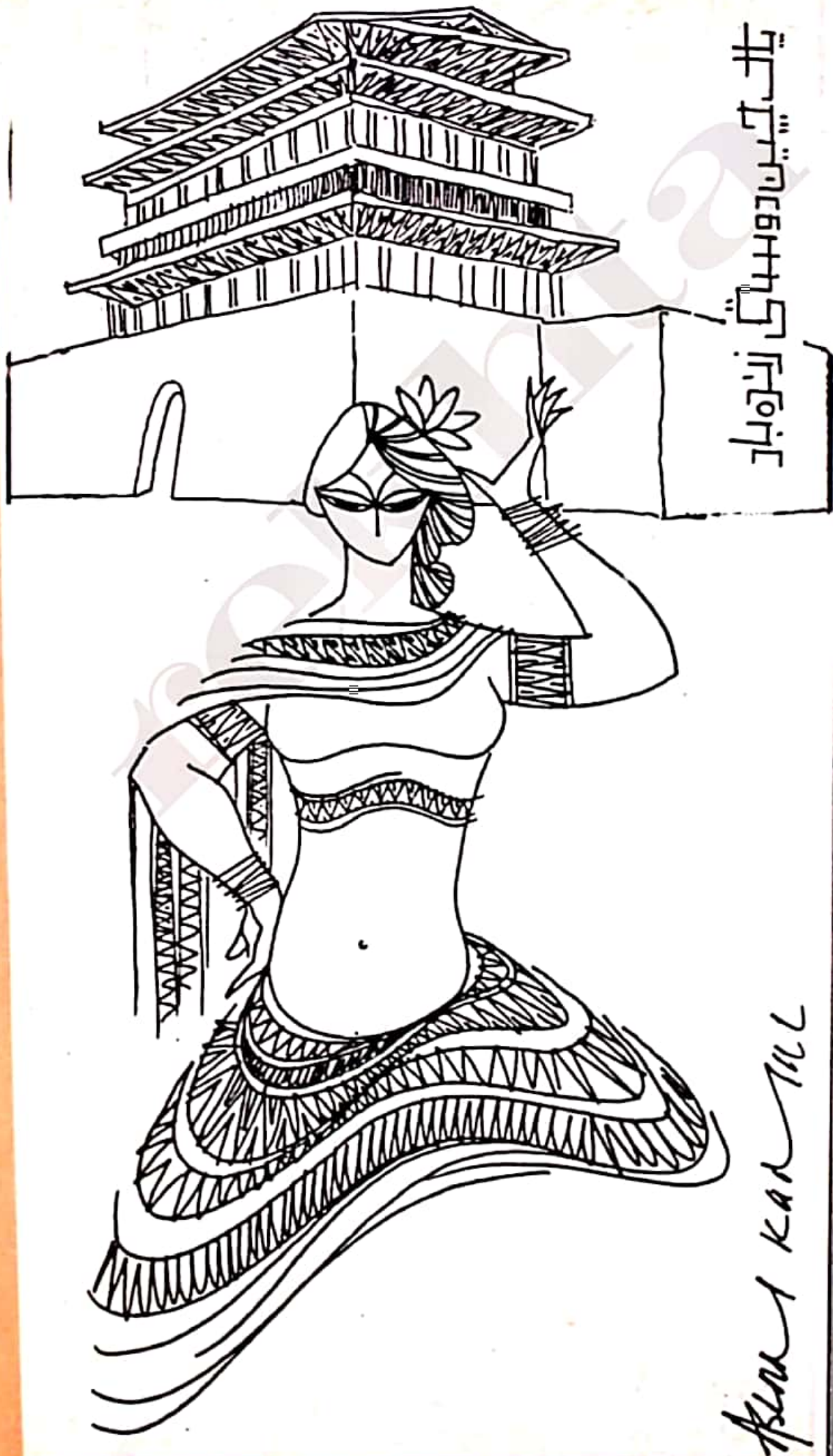
اب نیچے پہاڑی علاقہ ہے کہیں کہیں برف اور جا بجا بادل، دُھند، دھوپ

مَیں اپنی سیٹ پر واپس آ گیا۔ مَیں نے گھنٹی دی اور ہوسٹس نے مُسکرا کر حسبِ دستور پوچھا۔ "چائے کا کپ۔"

"ابھی لیجئے۔" اور چند منٹ بعد وہ چائے دے گئی۔ چائے کا گھونٹ لے کر مَیں نے کھڑکی سے دیکھا۔ زمین کے منظر میں پہاڑ ہیں اور اُن پر تیرتے ہُوتے بادل —— مَیں واپس راکاپوشی۔ نانگا پربت اور کے ٹو کی تنہائیوں۔ پاکیزگیوں اور رفعتوں کی جانب لوٹ گیا۔ کے ٹو نانگا پربت، راکاپوشی۔ قراقرم۔ قراقرم۔

نانگا پربت کے ٹو —— راکاپوشی راکاپوشی ....

راکاپوشی۔ راکاپوشی۔ راکاپوشی۔ راکاپوش

کون سے کوہِ ندا پر تجھ سے ہونگے ہم کلام

کون سی تنہائیوں میں تیرے ہوں گے روبرو

اِک تلاشِ رائیگاں میں ....

اِک تلاشِ رائیگاں میں اِک ہجومِ بے اماں

کس طلب میں پھر اُٹھے ہیں قتل گاہوں کو قدم
یہ سفر یہ راستہ . . . .
یہ سفر یہ راستہ جانے کہاں لے جاتے گا
کون سے پیڑوں پہ . . . . . .
کون سے پیڑوں پہ نکلیں گے . . . . . .
کون سے پیڑوں پہ نکلیں گے ثمر
کون سے پیڑوں پہ نکلیں گے مُرادوں کے ثمر
کس گلی میں کہکشاں سے ٹوٹ کر بکھریں گے ہم
کس نگر میں شام ہو گی کس ڈگر پہ روشنی
ہم تو ہر ساحل پہ اُترے ہیں ستارہ دیکھ کر
کس نگر میں اِکاّ دُکاّ نقشِ پارہ جاتے گا
کون سے سنگِ ستم کا زخم ہو گا آخری
کون سی خواہش . . . .
کون سی خواہش کا ـــــ ہونے کے بعد
کون سی خواہش کا قتلِ ناروا ہونے کے بعد
کون سی زنجیر پہنیں گے رہا ہونے کے بعد
ایک دشتِ نامُرادی اک ستارا شام کا
جلتا بُجھتا دل میں شُعلہ حسرتِ ناکام کا
ایک صُورت اجنبی سی اور کچھ مانوس سی
تھرتھراتا ہے لبوں پہ حرفِ اوّل نام کا
" خواتین و حضرات ، جہاز کا کپتان آپ سے مخاطب ہے ۔ چند لمحوں

بعد ہم بیجنگ کے ہَوائی اڈے پر اُترنے والے ہیں ۔آپ سے
درخواست ہے کہ سگریٹ بُجھا دیں اور حفاظتی بند باندھ لیں۔
اُمّید ہے کہ آپ کا یہ سفر خوشگوار گزُرا ہو گا۔
شُکریہ !"

میں کھڑکی سے باہر دیکھتا ہوں اور منتظر ہوں کہ چین کی سرزمین پر پہلا واضح منظر کونسا آنکھ دیکھتی ہے۔ چین۔ ماؤزے تنگ کا دیس۔ چو، این، لائی کا وطن —— ہیون سانگ کا دیس۔ کنفوشش کی سرزمین، دیوارِ چین والا ملک۔ میرے وطن سے عمر میں دو سال چھوٹا۔ میرے ملک سے کئی گنا رقبہ میں بڑا ملک۔ دنیا کی تیسری سپر پاور —— چھوٹے قد اور گول گول سوئی سی آنکھوں والی زرد نسل کا وطن —— جہاں راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔

بلندی کم کرتے جہاز کی کھڑکی سے جو پہلا واضح منظر دیکھا۔ ایک کھیت میں تین کسان ہیں۔ پھر کچھ سائیکل سوار سڑک پر۔ پھر ٹرالیاں۔ ٹرک اور ٹریکٹر۔

جہاز سے اُترے تو چینی محکمہ سیاحت اور فنون کے حکام نے ہمیں خوش آمدید کہا۔ وی آئی پی لاؤنج میں پہنچے تو پاکستانی سفارت خانے کے اہل کاروں سے ملاقات ہوئی۔ یہ لاؤنج خوب صورت اور کشادہ ہے اور دیواروں پر چینی روایتی مصوری اور خطاطی کے شہ کار آویزاں ہیں۔

جیسے ہی نشستوں پر بیٹھے ہمارے سامنے پہلے سے رکھے ہوئے چینی کے مگوں میں گرم پانی دو چینی لڑکیوں نے تھرماس میں سے ڈالا۔ تقریباً چالیس سیکنڈ بعد باقاعدہ چینی میزبانوں نے مگ اُٹھا کر ہونٹوں سے لگائے اور ہمیں بھی پینے کی دعوت دی۔ تو ایک پاکستانی سفارت کار نے میرے کان میں کہا۔

چائے پیجئے حضور۔ پتی تو کپ میں پہلے سے موجود تھی۔ البتہ دودھ اور چینی نہ پہلے ڈالی تھی نہ بعد میں ڈلے گی۔ بسم اللہ۔

سردی سے ٹھٹھرے ہوئے تھے۔ فوراً کپ اُٹھایا اور ہونٹوں سے لگایا اور گرم پانی نے ہونٹ جلائے تو بے ساختہ بسمِ اللہ نکلا۔ خُدا جانے الحمدللہ اب کتنے دنوں بعد کہیں گے۔

تفصیلی تعارف شروع ہوا۔ نیلی جیکٹ نیلی پینٹ اور سر پر نیلی ماؤ کیپ۔ سب گول گول اور چھوٹے چھوٹے اور موٹے موٹے روشن آنکھوں اور تمتماتے چہروں والے چینی میزبان ـــ چینی چائے کا پھر کپ اُٹھایا۔ لبوں سے لگایا۔ برائے نام چُسکی لی۔ اور واپس رکھ دیا۔ مگر پھر دوسرے گھونٹ کے لیے اُٹھا لیا کہ سردی مجبور کر دینے والی تھی ریڈ فلیگ اور پیکنگ جیپ گاڑیوں پر ہمارا قافلہ ریسٹ ہاؤس کی جانب چلا۔

۷

ائرپورٹ سے نکلتے ہی کھیتوں اور دہقانوں کا منظر سڑک کے دونوں جانب ہے۔ شام کا وقت ہے اور سورج ہمارے عین سامنے سڑک کی سیدھ میں کہیں درختوں کی اوٹ میں ہے۔ اگر سڑک پر توجہ مرکوز رکھی جائے اور دونوں جانب کے مناظر ذہن سے نکل جائیں تو یہ سڑک تزئین و آرائش اور کشادگی کی مماثلت سے زیرو پوائنٹ سے آب پارہ کی سی ہے۔ سڑک پر زیادہ تر آمدورفت چینی بچوں کی پیدل اور بذریعہ سائیکل ہے۔ جو اسکول سے آرہے ہیں اور چینی لوگ دفاتر اور کارخانوں سے، ٹرک اور ٹرالیاں زیادہ ہیں۔ بسیں نمبر ۲ پر اور کاریں صرف وہ جن پر ہم سوار ہیں۔ دو رویہ لگا ہُوا درخت پاپولر ہے۔ البتہ خزاں کی وجہ سے ٹُنڈ مُنڈ اور اسی حالت میں باغات بھی دونوں جانب ہیں۔ پیدل چلنے والے لوگ سڑک سے اُتر کر اطراف ہی پر چلتے ہیں اور آپس میں گپ شپ کرتے ہوئے کم دکھائی دیتے ہیں۔ اِن میں مرد و زن کی خاص شناخت نہیں۔ لباس ایک اور وضع قطع بھی ایک اور یوں لگتا ہے۔ اُن سب کو جہاں کہیں بھی جانا ہے۔ شام ہو جانے سے پہلے پہنچنا ہے۔ ابھی تک پیکنگ شہر کی آبادی

شروع نہیں ہُوئی۔ ایک لڑکی اور ایک لڑکا عجیب رومانٹک وضع کے ہیں ہاتھوں میں ہاتھ دیے دوسرے لوگوں سے ذرا دُور ٹنڈ مُنڈ درختوں کے بیچوں بیچ چل رہے ہیں کوئی اُن میں ربط نہانی خاص ہے۔ یہ محسوس کر کے دِل کو بڑا حوصلہ ہُوا۔

بیجنگ شہر کی آبادی شروع ہوگئی۔ جو ماضی قریب میں پیکنگ تھا اور ماضی بعید میں جسے پنجاب کے وارث شاہ نے پیکھین اور مراکش کے ابنِ بطوطہ نے پیکن لکھا۔ پنجابی شاعر کو تیلی پیکھتے دی بڑی البیلی اور سجیلی لگی تھی اور مراکشی سیاح کو پیکن کے صورت گر بہت پسند آتے تھے۔

بیجنگ شہر میں سڑکوں پر سیلاب سائیکل سواروں کا اور فٹ پاتھوں پر بھیڑ لوگوں کی انارکلی کی سی ہر طرف دکھائی دیتی ہے۔ انارکلی کی بھیڑ اپنی خوش رنگی اور خوش لباسی سے خوشگوار اور بیجنگ کی سڑکوں پر انسانوں کا انبوہ ایک لباس ایک چال ڈھال کی وجہ سے گھمبیر مگر پُرشکوہ ہے۔

ائرپورٹ سے تقریباً چالیس منٹ کی ڈرائیو کے بعد ہماری گاڑیاں بڑی شاہراہ سے بائیں ہاتھ ایک چھوٹی سڑک پر مُڑ گئیں اور ہمارے ساتھ بیٹھا ہُوا نیلے سوٹ اور ٹائی میں کامریڈ شان گویا ہُوا۔

"صاحب یہ اُمید ہے کہ آپ لوگوں کو بیجنگ پسند آیا ہے۔ اس وقت شام کا وقت ہو رہا ہے۔ صبح جب ہو گی اور اُجالا میں ہر چیز چمکے گی۔ تو آپ کو یہ بیجنگ اور بھی دلکش یعنی دل کو کھینچنے والا لگے گا"

"صاحب آپ اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں ٹھہریں آپ کو یہ رہائش گاہ بڑی پُرلطف لگتی ہے"

تب ہماری گاڑیاں ایک گیٹ میں داخل ہو کر دائیں جانب ایک

پارک نما احاطہ میں ایک چھوٹی سی سڑک پر رینگنے لگیں۔ پھر موٹر مڑا اور ایک کمان نما تنگ پُل سے گزر کر بائیں چکر کاٹ کر ایک اور ویسے ہی پُل پر سے گزریں۔ دائیں مُڑیں اور ایک پورچ میں رُک گئیں۔ دو چینی لڑکیوں نے دروازے وا کر کے خوش آمدید کہا۔ پھر پہلے فلور پر ہماری رہنمائی ہمارے کمروں کی طرف کی گئی۔ نہایت کشادہ کمرے سُرخ اور بھورے قالین۔ بیڈ شیٹ روایتی چینی سلک کے حریری پردے اور نفیس صوفے ــــ خوب صُورت ڈرائنگ رُوم اور ننھّا سا آراستہ پیراستہ دفتر ــــ ٹیلی فون ٹرانسسٹر رنگین ٹی وی اور فریج میں دُخترانِ رز کے منجمد غمزے عشوے اللہ اللہ سمجھ آئی کہ ابر کیا چیز ہے ہَوا کیا ہے۔ اور باتھ روم کی جلوہ سامانیوں میں ابھی دیدۂ حیرت کھُلا ہی تھا کہ کامریڈ شان ٹپک پڑا۔

" صاحب میرا خیال ہے۔آپ کو یہ جگہ کافی پسند آئی ہے۔ جلدی کیجئے کھانا لگ گیا ہے۔"

آپ کا خیال درست ہے۔کامریڈ شان اسی لیے تو آئینہ میں اپنا کمالِ جلال و جمال تلاش کرنے میں کچھ وقت لگے گا بس چلتے ہیں۔

"آپ جلدی جلدی آ جایئے۔ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" اور کامریڈ چلا گیا۔ گرم گرم پانی سے مُنہ دھویا۔ آنکھیں صاف کیں۔ بال سنوارے۔ ہاتھی دانت کی کنگھی تھی۔ بڑی پیاری کنگھی اتنی نفیس کنگھی تھی کہ بال بناتے ہُوئے سامنے آئینے میں دیکھا تو اپنی بجائے خاقان خاور اور جلیل عالی کے عکس دکھائی دیتے تھے۔ ڈائننگ ہال کو جاتے ہُوئے در و دیوار کی رونقوں کے لیے داد بے ساختہ نکلی۔ سادگی اور پُرکاری میں خراماں انسان بھی پُروقار

بن جاتا ہے۔ دیویا تائی اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس باہر سے جتنا خاموش خاموش اور اُداس سا ہے۔ اندر سے اتنا ہی متاثر کرنے والا ہے۔

کھانے پر بیگم ارباب نیاز ارباب نیاز آغا ناصر اور حبیب الرحمٰن اور چینی میزبان تیار تھے۔ کھانے کی گول میز کے گرد کُرسیاں اور میز پر ایک گول گھومنے والا تختہ جس پر کھانے سجائے جاتے ہیں۔ چینی لڑکیوں نے کھانا دینا شروع کیا۔ لڑکیوں کا کھانا کھلانا پُرانی چینی روایتِ مہمان نوازی ہے اورنج جُوس اور سوڈا گلاس میں لڑکیوں نے ڈالا اور کھانے کا پہلا کورس شروع ہُوا۔ ہم سب نووارد سفارت کار حبیب الرحمٰن کی جانب دیکھتے۔ وہ اشارہ کرتا۔ اور ہم تناول فرمانے لگتے۔ ایک کورس دو کورسز پھر کئی کورسز خُدا خُدا کر کے کھانا ختم ہُوا۔ اور نقل مارنے سے فُرصت ملی تو سیب۔ کینو اور کیلے کھائے۔ کیلے ہری چھال کے مگر چھوٹے سائز کے۔ کینو مریل سے۔ مگر سیب لذیذ خستہ اور شیریں تھے۔ سب نے ایک کی جگہ دو۔ دو تین، تین کھائے۔ کہ بھُوک مٹانے کا یہی طریقہ تھا اور یہ دریافت کرنا آداب کے منافی تھا کہ چنگوا راولپنڈی، می کا نگ اور شنگھائی لاہور والے چینی ہوٹلوں میں ملنے والے چینی کھانے کب دیں گے۔ پھلوں میں ہماری اس قدر دلچسپی سے متاثر ہو کر چینی میزبان خاتون مادام چنگ نے کچھ کہا۔ جس کا ترجمہ کامریڈ شان نے کیا۔

"صاحب آپ کو پھل شاید زیادہ پسند آتے ہیں۔"

"ہاں ہم کھانے کے بعد پھل فروٹ ضرور کھاتے ہیں"۔ ارباب نیاز نے کہا۔

کھانے کے بعد فوراً ہمیں پیکنگ کے کیپٹل تھیٹر لے جایا گیا جہاں ہم نے شاہراہ ریشم (سلک روٹ) بیلے دیکھا۔ پس منظر یوں ہے۔ تانگ خاندان

(۹۰۷-۶۱۸) عیسوی میں چین کے ایک اُستاد مصوّر یانگ نے ایک ایرانی تاجر انیس کو شاہراہِ ریشم کی کٹھنائیوں میں ہمیشہ کے لیے گُم ہو جانے سے بچایا۔ اس طرح وہ دونوں دوست بن گئے۔ مصوّر یانگ کی ایک بیٹی حادثے میں کھو گئی تھی۔

پہلے سین میں مصوّر یانگ نے اپنی گُم شدہ بیٹی کو دن ہانگ کی منڈی میں دیکھا تھا۔ ایک تھیئٹریکل کمپنی میں ایک غلام رقاصہ کے رُوپ میں۔ سوداگر انیس نے معاوضہ دے کر یانگ کی بیٹی ینگ نیانگ کو آزاد کرا لیا۔

دوسرے سین میں دکھایا گیا کہ مصوّر یانگ نے دن ہانگ کی غاروں میں بہت ساری رقاصائیں پینٹ کی ہوتی ہیں۔ اِن سب میں اُس نے اپنی بیٹی کی شباہت دُہرائی ہے۔ ایک بدمعاش مجسٹریٹ ینگ نیانگ لڑکی کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یانگ بجائے اپنی لڑکی حاصل کرنے مجسٹریٹ کے ہتھکنڈوں میں پھنس جاتا ہے۔ اور اپنے دوست انیس سے التجا کرتا ہے کہ وہ اُس کی بیٹی کو اِس مصیبت سے دُور ایران اپنے ساتھ لے جائے۔ بدمعاش مجسٹریٹ غصّے میں یانگ کو زنجیریں ڈال کر غاروں میں بند کر دیتا ہے اور سزا کے طور پر میورل پینٹ کرنے کا حکم دیتا ہے۔

تیسرے سین میں دکھایا گیا ہے کہ ینگ نیانگ کافی عرصہ سے ایران میں رہ رہی ہے اور اُس نے اپنے بہت سارے دوست بنا لیے ہیں۔ اور بہت سارے کرتب بھی سیکھ لیے ہیں۔ دریں اثنا۔ انیس کو سفیر بنا کر چین بھیجا جاتا ہے اور وہ ینگ نیانگ کو بھی اس کے وطن واپس لے آتا ہے۔

چوتھے سین میں مصوّر یانگ کو بے انتہا پریشان دکھایا گیا ہے۔ وہ

بے تاب و بیقرار ہے۔ اپنی بچی کے فراق میں اور اپنی تخلیق کی ہوئی خیالی جنت میں اُسے ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ ایک فوجی گورنر اِس غار کی سیر کو آتا ہے اور یانگ کے فن میں گُم ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ یانگ سے روا رکھی گئی زیادتی کا ازالہ کرتے ہُوئے آزاد کر دیتا ہے۔

انٹرول ہو گیا اور ہمیں تھیئٹر کے لاؤنج میں چلتے دی گئی آغا ناصر اور مَیں چینیوں کے فن تمثیل کی مہارت کے سحر میں کھوئے کھوئے سے تھے۔ پردہ کیا اُٹھتا تھا۔ نظروں میں ایک نیا اُفق روشن ہو جاتا تھا۔ حیرت کا باب کھُل جاتا تھا۔ سیٹ ڈیزائننگ میں چینی کمال کو پہنچے ہوئے ہیں۔ رنگ اور روشنی کا تناسب اور امتزاج دیدنی تھا اور اداکاروں کی ہُنرمندی دم نہیں مارنے دیتی تھی۔ ایک سین سے دوسرے سین کے درمیان بمشکل ایک منٹ کا وقفہ اور اس قدر سُرعت سے سیٹ بدلتا ہے کہ تماشائی دنگ رہ جاتے ہیں۔ یہی وجہ تھی یہ کھیل گزشتہ چھ ماہ سے چل رہا تھا۔ اور آج بھی ہال لبالب بھرا ہُوا تھا چینی رقاص لڑکے اور لڑکیاں تو جیسے آتش بجان تھے اُن کے ملبوسات زیورات حرکات و سکنات ترتیب و تنظیم ورطۂ حیرت میں ڈالتے تھے۔

پانچواں سین شروع ہُوا بدمعاش مجسٹریٹ نے اپنے ٹولے کے ساتھ سوداگر انیس کو مارنے کی سازش کی۔ یانگ نے مشعل جلا کر انیس کو بچانے کی کوشش کی مگر اپنی زندگی دوستی پر قربان کر گیا۔

ساتویں سین میں فوجی گورنر نے ون ہانگ میں ۲۷ ملکوں کے مہمانوں کے استقبال میں ایک پارٹی دی۔ جس میں ینگ نیانگ بھیس بدل کر آتی اور رقص کرنے کی پیشکش کرتی ہے اور اپنے فن کے ذریعے مجسٹریٹ کی بدمعاشی آشکار کرتی ہے۔ مجسٹریٹ گرفتار کیا جاتا ہے اور یوں شاہراہ ریشم کا ایک

خفیہ خطرہ ختم ہو جاتا ہے۔ اختتام میں میزبان اور مہمان ایک دوسرے کے لیے خیر سگالی کے جذبات کا اظہار کرتے ہیں اور الوداع کہتے ہوئے چینی عوام کے ساتھ دوستی کے فروغ کی اُمید کرتے ہیں۔

چینی ہُنرمندوں کے فن نے ایک عجیب سی فرحت سے ہمکنار کر دیا تھا۔ کہانی کا تسلسل اور روانی جس طرح رنگ و نور کے زیرو بم سے ہم آہنگ ہوتا تھا۔ اس کا ایک جادو تھا۔ جس نے ہمیں مبہوت کر دیا تھا۔

باہر نکلے تو ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔

ندو۔ یہ آواز میرے قریب سے آئی۔

اندو۔ پھر یہ آواز سنائی دی تو مَیں سنبھلا۔ ایک چینی لڑکی ایک دوسری لڑکی سے میری طرف اشارہ کر رہی تھی۔

اندو۔ اس نے تیسری بار کہا تو مَیں چوکنا ہُوا۔ کامریڈ شان سے پوچھا کہ یہ کیا کہہ رہی ہیں۔ اُس نے بتایا کہ وہ مجھے ہندوستانی کہہ رہی ہیں

کامریڈ شان اسے کہو۔ مَیں پاکستانی ہوں۔ مُسلم ہوں۔ مَیں نے کہا

نہیں جناب وہ خدوخال کے لحاظ سے یوں کہہ رہی ہے۔ کامریڈ نے مجھے تسلی دی۔ کامریڈ اُسے کہو کہ یہ خدوخال پاکستانی ہیں۔

کامریڈ شان گیٹ تک بھاگتا ہُوا اُن لڑکیوں تک گیا اور انھیں بتا کر واپس آیا۔

ٹھیک ہے ؟ کامریڈ نے کہا۔

بالکل ٹھیک ہے کامریڈ۔

—— واپس اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس پہنچے تکان سے بُرا حال ہو رہا تھا۔ گرم گرم پانی سے نہائے۔ پھر اُسے یاد کیا جو کبھی نہیں سوتا اور سو گئے۔

穆罕默德·阿斯拉姆·卡玛尔 先生

۷
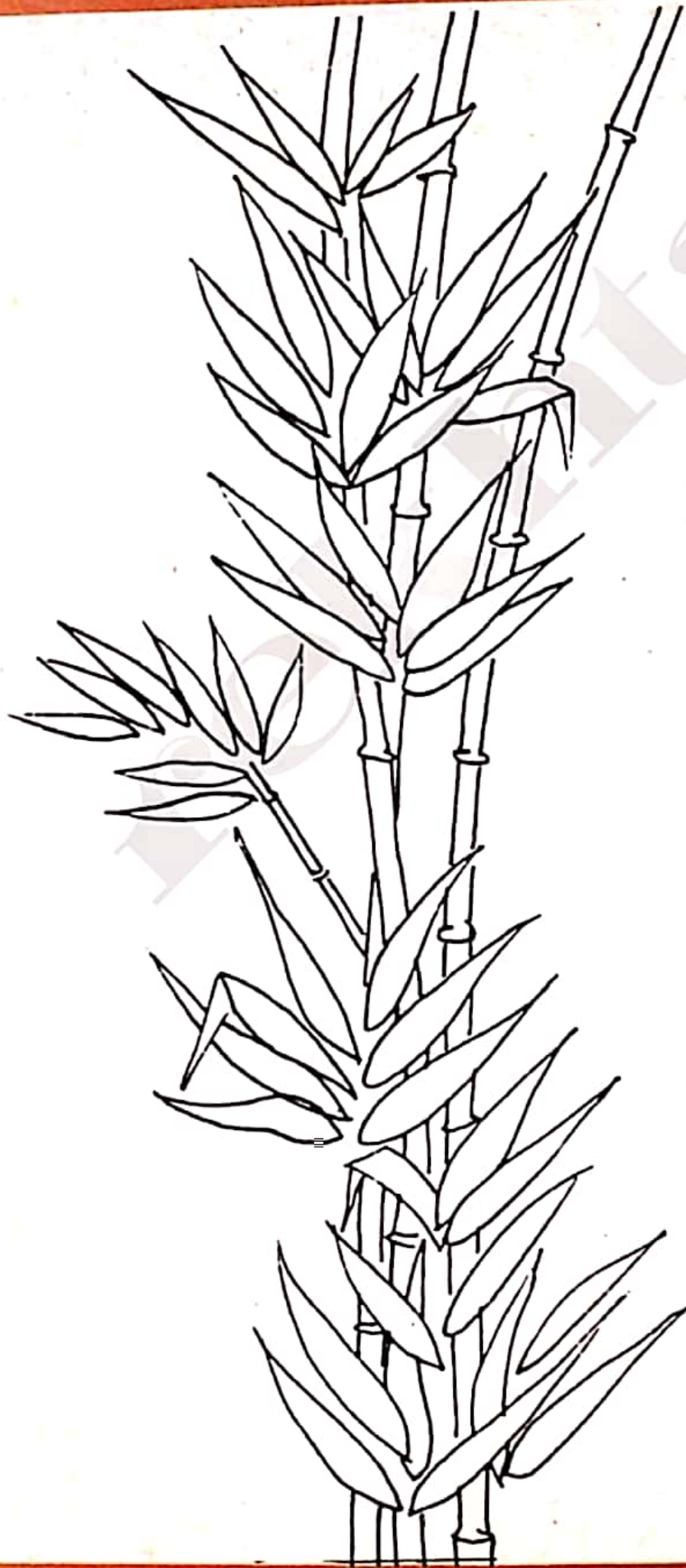
۱۳ ر نومبر کی صُبح جلدی بیدار ہو گیا اور مغربی کھڑکی کھول کر باہر جھانکا تو سوائے درختوں کے جنگل کے اور کچھ بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔ تیار ہوئے اور ناشتہ مل کر کیا۔ اور پیلیس میوزیم کی سیر کو روانہ ہُوئے۔ سائیکلوں کا سیلاب ہر گلی اور ہر سڑک پر جتنی بڑی سڑک ہے۔ سائیکلوں کا سیلاب اتنا ہی تند و تیز ہے۔ ہم پُرانے بیجنگ شہر سے گزرتے ہوتے ایک خندق کے پُل پر سے گزُر کر ایک پُرشکوہ دروازے سے داخل ہوتے ہیں۔ یہ پیلیس میوزیم ہے۔ کیمرے گلے میں لٹکاتے ہوئے دیس دیس کے سیّاح مرد و زن کا ایک ہجوم ہے۔ جو اس عظیم الشان میوزیم کو دیکھنے آیا ہے۔ چینی مرد و زن کی بھی کافی تعداد ہے۔ مرد تو قومی لباس میں ہیں۔ مگر عورتیں اور بچے مختلف لباسوں میں ہیں۔ پیلیس میوزیم محلات کا ایک سلسلہ ہے۔ جسے چینی سانگ اور کنگ خاندانوں نے اپنے اپنے عہد میں آگے بڑھایا ہے۔ یوں اِس قصر آباد کا معمار صدیوں کا تسلسل ہے۔ پیلیس میوزیم کو عرفِ عام میں شہرِ ممنوعہ کہتے ہیں اور اس کی تاریخ پانچ صدیوں پر محیط ہے۔ ۱۴۰۶ء میں منگ شہنشاہ ینگ لو کے زمانے میں ۲ لاکھ مزدوروں نے

اسے پندرہ سال میں مکمل کیا۔ اِس میوزیم کا رقبہ ۷۲۰,۰۰۰ مربع میٹر اور ۱۵۰,۰۰۰ مربع میٹر رقبہ پر حصّہ تعمیر ہے۔ یہ دس میٹر اُونچی فصیل کے اندر ہے اور فصیل کے باہر ۵۲ میٹر چوڑی خندق ہے۔ پیلس میوزیم میں تقریباً ۹,۰۰۰ کمرے ہیں اور اس کا لے آؤٹ جیومیٹریکل ہے۔ اور خوب گٹھا ہوا ہے۔ محلات کی یہ کہکشاں قدیم چینی طرزِ تعمیر کا نادر نمونہ ہے۔

پیلس میوزیم عقبی اور پیشی دو حصوں پر مشتمل ہے۔ سامنے کے حصے میں تین بڑے ہال ہیں۔ جن کو سپریم ہارمنی، کمپلیٹ ہارمنی اور پری زرونگ ہارمنی ہال کہتے ہیں۔ سپریم ہارمنی ہال باقی دو سے بہت زیادہ خوش نما ہے۔ یہاں بادشاہ کی رسم تاجپوشی۔ سالگرہ جشنِ سالِ نو اور دوسری اہم تقریبات منعقد ہوتی ہیں۔ اسے طلائی تخت والا ہال بھی کہا جاتا تھا۔ اِس محل کے تین عالیشان دروازے ہیں۔

عقبی حصے میں بھی تین محل ہیں جن کو قصرِ جنّت، قصرِ اتحاد اور قصرِ سکون کہتے ہیں۔ اِس کے مغرب میں چھ محل ہیں اور چھ مشرق میں یہ شہنشاہ اور اس کی داشتاؤں کے لیے ہے۔

پیلس میوزیم میں چینی تہذیب و تاریخ اور ثقافت کا ایک قیمتی سرمایہ ہے۔ آلاتِ حرب، ملبوسات، زیورات، مصوری اور خطاطی کے شاہکار، دھات اور پتھر کے مجسمے۔ ظروف، قالین اور تخت و تاج نہایت عمدہ طریقے سے نمائش کے لیے سجائے گئے ہیں۔ حکمرانوں کو ایک محل سے دوسرے محل تک لے جانے کے لیے کرسی نما سواری ہے۔ جیسی مرزا غالبؔ کے زمانے میں پیلس ہوا کرتی تھی۔ جسے کہار اُٹھا کر چلتے تھے۔

بادشاہ کی شب بسری کے لیے حفاظتی اقدامات کے طور پر ایک ہی

نمونے کی ایک ہی جیسے سامان سے آراستہ ۲۷ خواب گاہیں ہیں۔ تاکہ رات کو بادشاہ کس خواب گاہ میں ہے یہ پتہ نہ چل سکے۔ ویسے بھی یہ شہنشاہیت کی عالمگیرانا ہے کہ وہ اپنی مملکت میں ہر جگہ اپنی موجودگی کا احساس چاہتی ہے۔ اپنی رعایا کی ہر خواب گاہ اور اُن کے خوابوں تک میں اپنی موجودگی چاہتی ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ جب کبھی رعایا مہم جوئی پہ اُترتی ہے تو ان خوابوں کی سرنگوں میں سے ہوتی ہوئی شہنشاہوں کو زمین کی پاتال میں سے بھی ڈھونڈ نکالتی ہے۔

محلات کا ماحول بھی کرۂ ارض پہ ایک ہی طرح کا ہوتا ہے۔ جو ایک ہی طرح کی سازشیں جنم دیتا ہے اور جب ان سازشوں میں سازشیوں کی تمام عقل خرچ ہو جاتی ہے تو یہ محلات عوام پر اپنے دروازے کھول دیتے ہیں۔

اِن محلات میں ایک شہنشاہ نے اپنے بے شمار بیٹوں میں سے نمبر ۱۴ کو اپنا جانشین بنانا چاہا اور اس کا نمبر ۱۴ لکھ کر چٹ تخت کے پیچھے آویزاں ایک خطاطی کی اوٹ میں صندوقچی میں ڈال دی۔ نمبر ۱۴ کو تو خبر نہ ہوئی البتہ نمبر ۴ نے ہشیاری سے اِس چٹ پر ۱۴ کا ایک غائب کر دیا اور باپ کی وفات کا انتظار کرنے لگا اور بالآخر شہنشاہ بن ہی گیا۔ اسی سلسلہ محلات میں ایک زندہ ملکہ کو کنوئیں میں دھکیل دیا گیا تھا۔ اُسی کنوئیں پر تختی لگی ہے۔

❀

پورے میوزیم میں نیلا، سبز، گہرا سبز اور مٹیالہ رنگ بکثرت ملتا ہے۔ اب سُرخ ان سب پر حاوی ہے۔ جو انقلاب کے بعد داخل ہُوا ہے۔ سُرخ کی زیادتی سے باقی رنگوں کا حال وہی ہے جو فاتح کے سامنے مفتوحین کا ہوتا ہے۔

اس میوزیم کی سیر کے لیے بہت ہی زیادہ وقت درکار ہے۔ وقت جو ۱۹۱۱ء میں اِس شہرِ ممنوعہ کے عقبی حصّہ کی دیوار پھاند کر اندر داخل ہو گیا۔ اور منگ شہنشاہ نے انقلابیوں کے نعرہ ہائے حرّیت کے ہانکے میں خودکشی کا راستہ اپنایا تھا۔ چینی حُرّیت پسندوں کی تصاویر جو معاصر چینی مصوّروں نے تخلیق کیں۔ یہاں آویزاں ہیں۔ اِس شہرِ ممنوعہ کا جنوبی حصّہ اب سرکاری دفاتر میں بدل گیا ہے اور برلبِ سڑک تیئن من واقع ہے۔ جس کی محراب میں چیئرمین ماؤ کھڑے ہو کر اہلِ وطن کو خطاب کرتے تھے اور ہم تصویریں دیکھا کرتے تھے۔ اب اس پر چیئرمین کی ایک تصویر آج بھی ویسے ہی لگی ہے اور ہم نے پورے دورۂ چین میں چیئرمین ماؤ کی سرِعام ہی ایک تصویر دیکھی ہے۔

پیلس میوزیم کی فصیل کے بیرونی حصّے میں مختلف قسم کے پوسٹر دیکھے تو استفسار کرنے پر محرمِ راز نے بتایا کہ رات کے پردے میں کچھ لوگ ناپسندیدہ اشتہار بھی لگا جاتے ہیں۔ یا نعرے لکھ جاتے ہیں۔ ہمیں وطنِ عزیز کے ایک صدرِ محترم بہت یاد آئے جو رات کی تاریکی میں اپنی سرکاری رہائش گاہ کی بیرونی دیوار پر اپنی رہائی کا مطالبہ لکھتے پائے گئے تھے۔ دروغ برگردنِ راوی۔

اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس واپس آئے۔ دوپہر کا کھانا کھایا اور وضو کر کے جُمعہ اَدا کرنے پُرانے بیجنگ کی مُسلم آبادی کے علاقہ نیوچے پُہنچے۔ مسجد ایک عام سی روایتی چینی عمارت ہے۔ اس کے رنگ و روغن بھی روایتی چینی ہیں۔ مسقف حصّہ میں قبلہ کی جانب ایک بڑی سی محراب ہے جس میں روایتی منبر ہے قبلہ والی دیوار پر پوری چوڑائی میں سورۃ حشر کی کچھ آیات لکھی ہیں۔

مسجد کا فرش چوبی ہے۔ صف بندی کے لیے قالین اور سجدہ کے لیے خالی جگہ امامِ مسجد خطبہ پڑھ رہے تھے۔ جب ہم پُہنچے۔ عصا تھامے ہُوئے منبر پر کھڑے تھے۔ سر پر پگڑی تھی داڑھی مختصر مگر آواز بلند اور بارُعب تھی۔ جماعت کھڑے ہونے تک تمام مسجد خاکِ حرم سے آشنا چینی، ہندی، عربی، پاکستانی، افریقی جبینوں سے بھر گئی۔ جو سجدہ کرتے وقت چوبی فرش سے ٹکراتیں تو بڑی ولولہ انگیز آواز گونجتی —— الحمد للہ رب العالمین ھا الرحمٰن الرحیم ھا مالک یوم الدین ھا —— بعد میں پُوچھنے پر پتہ چلا کہ ھا، حنفی فل سٹاپ ہے۔ سورۃ فاتحہ کے بعد سورۃ والتین پڑھی گئی جس میں انسان کو بہترین سانچے میں پیدا کرنے کے بارے میں خُدائے پاک نے فرمایا ہے۔ نماز ختم ہُوئی۔ چینی میں دُعا ہُوئی اور ہم نے آمین کہا۔ امام صاحب سے ملاقات ہُوئی۔ سب سے گلے ملے۔ اربابِ نیاز نے اس مسجد کے لیے قرآن پاک کا ایک نسخہ

عطیہ دیا۔ امام صاحب نے آنکھوں سے لگایا۔ چوما اور پھر ایک بار سب سے گلے ملے۔

امام صاحب کمیونسٹ پارٹی کے ایک سرکردہ ممبر ہیں۔ اور یہ مسجد ایک ہزار سال پُرانی ہے۔

مسجد سے واپسی پر پھر وہی سڑک کنارے بھیڑ اور سڑک پر سیلاب سائیکلوں کا۔ شام سمے یہ منظر کچھ اور گہرا ہو جاتا ہے جس میں تنظیم، ترتیب، یک جہتی، اور عزمِ منزل سب مل کر ایک دبدبہ پیدا کرتے ہیں۔ مَیں نے اپنے چینی میزبانوں سے کہا۔

"اے کامریڈو تم خواہ مخواہ ایٹم اور ہائیڈروجن کی بازی میں اُلجھ رہے ہو۔ ریگن اور برزنیف کو یہ منظر سائیکلوں کا دکھا کر کہہ دو کہ اس سیلاب کا رُخ ماسکو اور نیویارک کی جانب ہے۔ تو یقین جانو ان کے اندازے تمھارے بارے اور شاندار ہو جائیں گے۔

۹

چینی میزبانوں نے خوب خوب داد دی اور جگہ جگہ میرا فرمودہ دُہراتے تھے۔ سائیکلوں کے علاوہ ایک اور شئے جوجا بجا دیکھی۔ بلکہ بے جا دیکھی۔ وہ گوبھی کی کثرت تھی۔ میرا خیال ہے۔ وہ بند گوبھی اور پھُول گوبھی طرح کی کوئی تیسری قسم ہے۔ گوبھی کی۔ بڑے بڑے پتوں والی۔ ڈھیروں کے ڈھیر گوبھی کے بیجنگ میں کوئی شئے سرِعام گندگی پھیلاتی دکھائی دیتی ہے تو وہ گوبھی ہے۔ دکانوں پر گوبھی۔ عالی شان اپارٹمنٹس کی ریلنگ پر لٹکی ہوئی گوبھی، سائیکلوں کے کریئرز میں ٹکائی ہوئی گوبھی، ہاتھوں میں گوبھی اور کسی کسی جیب میں بھی گوبھی۔ کھانوں میں گوبھی کے روپ بہروپ گویا گوبھی چینیوں کی قومی پسند ہے۔ علّامہ اقبالؒ کے ملازم علی بخش بہت یاد آئے جنھوں نے مولانا گرامی کو بھگا دیا صرف یہ کہہ کر کہ "آج بھی گھر میں گوبھی پکی ہے۔"

گیسٹ ہاؤس پہنچے۔ جھٹ پٹ کمرے میں آئے۔ جرسی اُتار کر پھینکی۔ بوٹ اُتارے اور بیڈ پر نیم دراز ہو گیا اور اصنامِ خیالی کے حلقۂ خوش کُن میں ابھی بیٹھا بھی نہ تھا کہ انگریزی مترجم پیچھے پہنچ گئی اور سامنے صوفے پر بے حال ہو کر گرتی ہوئی بولی۔

چینی ثقافتی ٹیم سے مذاکرات چند منٹ بعد شروع ہونے والے ہیں۔
چند منٹ بھی بہت ہیں۔ مَیں نے کہا اور آنکھیں بند کرلیں۔ کے ٹو، نانگا پربت، راکاپوشی، گلگت، ہنزہ، سوات، اسلام آباد، شکرپڑیاں، فیصل آباد مری روڈ اور دائیں ہاتھ پکستھ روڈ۔
"چار منٹ ہوگئے" انگریزی مترجم بولی۔
مَیں نے بے دلی سے آنکھیں کھولیں۔ اُس کی طرف دیکھا اس کا چہرہ بھی کسی خواب کی دُھند میں دُھندلایا ہُوا تھا۔
ٹھیک ہے۔ مَیں ہاتھ منہ دھو کر آتا ہوں۔ بس آرہا ہوں۔ وہ تھکے تھکے قدم اُٹھاتی چلی گئی۔
گراؤنڈ فلور پر کانفرنس ہال میں لمبی میز کی ایک طرف چینی ثقافتی ٹیم اپنے وزیر کے ساتھ اور دوسری طرف اربابِ نیاز، آغا ناصر، افضل قادر، حبیب الرحمٰن اور راقم۔ میز پر چینی چائے کے کپ جن میں ہمارے بیٹھتے ہی گرم پانی ڈال دیا گیا۔ بعد میں پیسٹری آئی اور مذاکرات شروع ہُوئے۔ دونوں جانب سے خیرسگالی کے جذبات کا اظہار — نئے عزائم نئے ارادے اور نئی توقعات۔ گپ شپ۔ پھر حبیب الرحمٰن نے بروشر کا سووینئر چینی ٹیم کو بانٹا۔ جس میں خاکسار کے بارے میں معلومات اور کچھ تخلیقات کے عکس تھے۔ نہایت اچھا موسم، نہایت اچھی گفتگو، اکسانے والی چائے اور بہلانے والی پیسٹری، انگریزی میں ہماری جانب سے گفتگو اور ان کی طرف سے چینی میں۔ اُن کی طرف سے انگریزی بولی گئی تو صرف ایک خاتون نے بولی۔ جو وزیرِ ثقافت چین کی پرائیویٹ سیکرٹری اور انٹرپریٹر تھی۔ ڈیڑھ گھنٹے کے مذاکرات پُراتفاق رائے اور مجلس برخاست۔

نئی انگریزی مترجم کا لہجہ اور وکیبلری بڑی شاندار تھی۔ شکل بڑی دلپذیر اور عمر بڑی ہلاکت خیز۔ الغرض فتنۂ شہر نہ سہی فتنۂ محکمۂ ثقافت چین ضرور تھی۔ پس عرض کیا ارباب نیاز کے کان میں۔ "خاں صاحب انگریزی کتنی اچھی ہے اس کی؟"

"او یارا وِنڈرفُل بالکل ریئر ہے یہاں" خاں صاحب ایک دم بولے۔

"چینی تو لگتی نہیں بالکل جاپانی ہے" آغا ناصر بولے۔

صد شُکر کہ سارا وفد متفق تھا۔

رات کو چینی نائب وزیرِ اعظم نے پاکستانی ثقافتی وفد کو عشائیہ دیا۔ یہ تقریب گریٹ ہال آف دی پیپلز میں منعقد ہوئی۔ گریٹ ہال ایک وسیع و عریض کمپلکس ہے۔ نیچے اکیس ہال ہیں اور ایک ایک ہال اتنا بڑا ہے۔ جتنا پنجاب یونیورسٹی اولڈ کیمپس ہال اس کے علاوہ دفاتر۔ غسل خانے اور دیگر کمرے کتنے ہیں۔ معلوم نہیں ہے اور کتنے ہال اور کتنا کیا کیا اُوپر ہے۔ اُوپر والا ہی جانے۔ اس کی تعمیر جدید طرز کی ہے۔ آئینے جیسے چمکتے دمکتے فرش چپس سے مزیّن اور یوں مہذب کیے ہُوئے کہ ذرا سی بے دھیانی سے پاؤں پھسل جاتا ہے۔ دیواروں کے رنگ دھیمے اور خوشگوار، نفیس چینی پردے، عمدہ لکڑی کا منقش فرنیچر، عدیم النظیر فانوس، دیواروں پر چینی روایتی مصوری اور خطاطی کے شہکار آمنے سامنے اپنے سائز اور طرزِ نمائش میں چینی مہارت اور ذوقِ جمال کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ یہ گریٹ ہال بھی دس ماہ کی مدت میں چپس سے لے کر چھت تک تیار ہُوا۔ اور جدید چین کے آٹھ عجائب میں شمار ہوتا ہے اور یہ ایک لاکھ مزدوروں کی انتھک محنت کی مُنہ بولتی مثال ہے۔ تمام سرکاری تقریبات اسی جگہ منعقد ہوتی ہیں۔

کھانا شروع ہُوا کثرتِ خورونوش میں لذتِ کام و دہن نے صحت پر تو خوشگوار اثرات ضرور چھوڑے ہوں گے مگر حافظہ کمزور ہو گیا۔ اِس لیے کھانے کے کتنے کورس چلے یہ یاد نہیں ہے۔ انسان کھا کھا کر پی پی کر تھک جاتا ہے۔ ٹھنڈے یخ جُوس کے گھونٹ پر دوسرا گھونٹ دھواں دیتے سوپ کا اور اس پر مٹھائی کا نوالہ جو ابھی حلق میں ہوا ور گرم قتلہ مچھلی کا مُنہ میں۔ قِصّہ مختصر کھا کر پیو اور پی کر کھاؤ۔ گرم اور سرد نرم اور سخت سب نگلتے جاؤ بے دھڑک اپنے معدے سے مخاطب ہو کر ؎

تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہُوتے

یہاں تک کہ کھا کھا کر تھک جاؤ اور پکارنے لگو کہ کام پڑو تم اگر کسی کام میں وقت کا زیاں کرتے ہو تو کھانے میں ـــ کھانے کی اقسام اور کثرت اور مہمان نوازی کا ساتھ ہم گرتے پڑتے دیتے رہے۔ آغا ناصر نے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

"کاش ہمارے ساتھ اس وفد میں دو ایک مولوی حضرات بھی ہوتے"

ارباب نیاز نے آغا ناصر سے اتفاق کیا۔ "بالکل ٹھیک۔"

پھر اپنی بیگم سے مخاطب ہوئے۔ عینک اُتار کر۔

"موٹاپے کو روکنے کے لیے کھانے سے ہاتھ روکنا پڑتا ہے"

بیگم ارباب سادہ سی خاتون ہنس پڑی اور کھانے سے ہاتھ چھوٹ گیا۔

پھر جامِ صحت نوش ہوتے اور ارباب نیاز نے کھڑے ہو کر تقریر شروع کی اور کہا۔ مَیں تقریر اُردو ہی میں کرنا چاہتا تھا۔ مگر اُردو کا مترجم ادھر دکھائی نہیں دتیا۔ اِس لیے انگریزی میں کرتا ہوں۔ اِس بات پر نائب وزیرِ اعظم نے اپنی ٹیم پر ایک ناپسندیدہ نظر ڈالی۔ پھر اربابِ نیاز تقریر کرتے رہے اور

چینیوں کے نچلے درجے کے افسران میں تشویش ناک کاناپھوسی ہوتی رہی۔ مَیں نے اور آغا ناصر نے بھانپ لیا کہ آج ایک دو چینی افسر ضرور کلچر سے اگریکلچر میں پُہنچ جائیں گے۔

"آج کامریڈ شان کی خیر نہیں" آغا ناصر نے اندیشہ ظاہر کیا۔

مَیں نے اُسے پُوچھا تھا تو وہ یہ کہتا تھا مُجھے بُلایا ہی نہیں۔ مَیں نے کہا۔ ویسے اُس کا کچھ کرنا چاہیئے۔ نزلہ اُسی پر گرے گا۔

اور پھر ہم نے اربابِ نیاز سے یہ اندیشہ ظاہر کیا تو وہ نہایت خوبصورت طریقے سے کامریڈ شان کو بچا گئے۔ باہر نکلے تو اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ اور سڑکوں پر انسان بہت کم رہ گئے تھے۔ گاڑیوں میں بیٹھے اور گیسٹ ہاؤس روانہ ہوئے۔

پیلس میوزیم یعنی شہرِ ممنوعہ کی جنوبی دیوار پر برلبِ سڑک تیان من ہے۔ تیان من کے سامنے سڑک کے پار ایک کھلا میدان ہے۔ میدان کے درمیان عوامی ہیروز کی یادگار ہے۔ یادگار کے عقب میں چیئرمین ماؤ میموریل ہال (مقبرہ) اُس کے عقب میں کیان من یعنی پُرانے بیجنگ شہر کی فصیل کا ایک دروازہ ہے۔ بائیں ہاتھ گریٹ ہال اور دائیں ہاتھ ہسٹری میوزیم ہے۔ اِس سارے علاقے کو عُرفِ عام میں ریڈ سکوائر یا پیپلز سکوائر بھی کہتے ہیں۔ عوامی ہیروز کی یادگار کے قریب میں چلتی گاڑی میں سے دیکھتا ہوں۔ معمولی روشنی ہے باقی گھُپ اندھیرا چیئرمین ماؤ ہال کا ہیولا دکھائی دیتا ہے۔ جیسے ماؤ گہری نیند سو رہا ہو آسمان کی گہری کالی چادر اوڑھ کر جس پر چاند ستارے دمکتے ہیں۔ میرے دل میں کوئی آواز جاگی۔ باہر اندھیرا ہے۔ اندر بھی روشنی نہیں مگر اُجالا ضرور ہے۔

واپس اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس پُہنچے۔ گرم پانی کا غُسل کیا پھر آغا ناصر اور

حبیب الرحمٰن آ گئے ۔ گپ شپ ہوتی رہی یہ حبیب الرحمٰن جو پاکستانی سفارتخانے کا سیکنڈ سیکرٹری ہے ۔ ہمارے ساتھ ساتھ ہے ۔ شروع شروع میں مجھے اور آغا ناصر کو یہ عجیب الخلقت چیز بڑی پرائی پرائی سی لگی تھی ۔ چھوٹا قد جلا ہوا گندمی رنگ سر پہ بال بس بال بال بچے ہوئے چھوٹی اندر دھنسی ہوئی آنکھیں گول گول اور اُوپر نوکدار لمبی بھنویں درمیانی ناک اور مونچھیں قابلِ اعتراض قسم کی، گول چہرہ، چھوٹے چھوٹے بازو، موٹے ہاتھ، موٹی توند اور ٹانگیں بس ٹانگیں ہی تھیں ۔ گردن کا ذکر اِس لیے نہیں کرتا کہ وہ تھی ہی نہیں ۔ پیچھے سے چلتا دیکھیں تو لڑھکتا دکھائی دیتا تھا اور آتا دکھائی دے تو خنجر لہراتے ہوئے کسی قاتل کا شبہ ہوتا تھا ۔ دو دن میں ایسا گھُل مِل گیا اور ایسا کھُلا کہ بند ہونے کا نام نہ لیتا تھا ۔ فریج کھول کر کہنے لگا ۔

یہاں سے کوئی چیز نہ چکھنا نہ پینا ۔ یہ سب بدبودار ہیں ۔ ویسے بدبو گوارا ہو تو بھی ایک دوسرے کو گواہ نہ بنانا ۔

فریج بند کر یار ۔ پہلے ہی تمھاری بدبو کافی ہے ۔ آغا ناصر بولا ۔

چھُٹتی نہیں ہے مُنہ سے یہ کافر لگی ہوئی ۔ زور کس پر ہے یہ پر ۔ حبیب الرحمٰن نے آنکھ میچ کر کہا ۔

حبیب الرحمٰن بڑے مزے مزے کے چٹکلے سُناتا رہا ۔ بیجنگ اور چین کے دیگر شہروں میں پاکستانی طالب علم لڑکوں اور لڑکیوں کے مشاغل کے بارے میں اپنی معلومات کے خزانے لُٹاتا رہا ۔ اور چینی زبان اُس نے کس طرح سیکھ لی ہے ۔ یہ معرکہ بیان کرتا رہا اور پھر آہستہ آہستہ چینی عورتوں کی جسمانی ساخت پر لیکچر دینے لگا تو آغا ناصر اُسے بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہُوا میرے کمرے سے لے گیا جاتے جاتے حبیب الرحمٰن نے میری

طرف دیکھا اور سینہ پھیلا کر بولا۔

دیکھا باقی باتیں اب یہ مجھ سے اپنے کمرے میں سُنے گا۔

مَیں نے کپڑے بدلے بستر پر دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ تب اُس کا نُور میری رُوح میں پھیل گیا جو نُور ہے زمین اور آسمانوں کا۔

۹

۱۴ نومبر کے ناشتے کے بعد ارباب نیاز بمع اپنی بیگم کے ایک گلاس فیکٹری دیکھنے چلے گئے۔ آغا ناصر نیف ڈیک کے چکر میں اپنی منزل کو اور مَیں مادام چینگ اور کامریڈ شان کے ساتھ نیشنل آرٹ گیلری بیجنگ کی طرف روانہ ہُوئے۔ راستہ میں ہم ایک ڈیپارٹمنٹل سٹور اُترے۔ جہاں سے مَیں نے کیمرے کے لیے فلم خریدی۔ کچھ سگریٹ لیے۔ کرنسی وغیرہ تبدیل کرائی۔ نیشنل آرٹ گیلری پہنچے تو چینی مصوری کی ایک شاندار نمائش زوروں پر تھی۔ تقریباً دوسو کے لگ بھگ نئے شہکار تھے۔ جن میں روایتی چینی مصوری بھی اور جدید چینی مصوری بھی تھے۔ چینی مصور مرد و زن سے مُلاقات ہُوئی۔ اُن سے تبادلۂ خیالات ہُوا۔ چائے پی اور تصاویر دیکھنے لگے۔ آج موسم سخت سرد ہے اور نیشنل گیلری کے کُشادہ ہالوں میں یہ شدّت اور بھی محسوس ہو رہی ہے۔ کامریڈ شان شاہراہ ریشم کی تعمیر کے دوران گلگت ہنزہ وغیرہ میں رہا اور یہیں سے اُس نے اُردو سیکھی۔ بعد میں اسلام آباد میں کوئی کورس بھی کیا۔ مگر سڑک کی تعمیر کے دوران ہی اُسے یہ آتے آتے آنے والی زبان سیکھنے کا موقع ملا۔ بعد میں وہ اُردو ناولوں کی مدد سے اُردو کی مشق کرتا رہا۔ لہجے میں وہ بعض

اوقات اہل زبان تو کیا اہلِ لکھنؤ کی نزاکتوں کو بھی چھو لیتا تھا۔ مگر روزمرّہ کی
زبان میں شاہراہ ریشم کی اینٹ سیمنٹ بجری چونا کسی کدال سے زیادہ اُس
کے پاس کچھ نہ تھا۔ لہٰذا اس کے ذریعے کوئی ٹیکنیکل گفتگو کرنا عبث تھا۔ لہٰذا جو
مَیں کہتا وہ اُن سے خدا جانے اُس میں سے کتنا اور کیسے کہتا اور وہ جو مُجھ سے
کہتے کتنا مجھ تک پہنچتا۔ اِس لیے تصاویر کو زیادہ سے زیادہ دیکھنا ہی ایک
سودمند فعل تھا اور یہ ہم نے جی بھر کے کیا۔ نیشنل آرٹ گیلری لمبی چوڑی ہے۔
دومنزلہ ہے اور کئی کشادہ ہال ہیں۔ ایک ہال میں چین کی قدیم ترین مصوّری کے
نمونے جو ایک قبرستان سے برآمد ہوئے آویزاں ہیں۔ ان میں مصوّری بھی ہے
اور خطّاطی بھی۔ دونوں دعوتِ نظر دیتے اور دامنِ دل خُوب پکڑتے ہیں۔ مصوّری
کی یہ تصویریں منی ایچر ہیں، مرقع چغتائی میں کچھ چہرے جو چینی لگتے ہیں۔ اس
کی وجہ چین، ایران اور ہندوستان کے ثقافتی پس منظر میں چنگیز خان، قبلائی
خان اور بابر کے حوالے سے سمجھ میں کچھ کچھ آئی۔ خطّاطی میں مسلمانوں کے بعد
اگر کسی قوم کے پاس یہ سرمایہ ہے تو وہ چینیوں کے ہاں ہے۔ چینی خطّاطی کے
پانچ بڑے مکاتب ہیں۔ یہ خطّاطی اپنی روانی زاویوں، قوسوں اور دائروں اور
باہمی رچاؤ کے اعتبار سے اوجِ کمال کو چھُوتی ہے۔ ارتقائی تنوع کے اعتبار
سے مُسلم خطّاطی یقیناً اوّل نمبر ہے اور اسی وصف کی بدولت یہ اِس قدر جہتوں
کی کہکشائیں اپنے دامن میں رکھتی ہے کہ آج تک اسے پوری طرح دائرۂ نظر
میں سمیٹا ہی نہیں جاسکا۔ دوسری طرف چینی خطّاطی کی نگہداشت اور پرورش
جس ذوق وشوق سے کی جاتی ہے۔ قابلِ ستائش اور لائقِ تقلید بھی ہے۔ اِس
نمائش کی سیر سے آنکھ روشن، دل غنی، دماغ تیز اور روح تازہ ہوگئی۔ وزیٹر
بُک میں نقشِ کمال دادِ فن کے طور پر پیش کیا اور چینی مصوّر خواتین وحضرات

کے خوش آئند تاثرات لے کر واپس آئے۔

واپسی پر ریڈ سکوائر سے گُزرے تو مَیں نے سوچا کہ ایسا بھی کیا کہ ماؤ کے دیس میں آ کر بار بار پاس سے گزر جائیں اور ماؤ کے حضور حاضری نہ دیں۔ مَیں نے مادام چنگ سے کہا۔ ابھی تھوڑا وقت ہے۔ میری شدید خواہش ہے کہ مجھے ماؤ ہال کی سیر کروائی جائے۔ بڑی محتاط خاتون تھی کچھ سوچتی رہی پھر راضی ہو گئی۔ گریٹ ہال اور ہسٹری میوزیم کے درمیان میدان ہے۔ شمال میں تیان من اور اُس کے عین مقابل اِس میدان میں چینی عوامی ہیروز کی یادگار ہے۔ اس کے عقب میں ماؤ میموریل ہال۔ ہال کے سامنے بھی اور عقب میں بھی دونوں جانب تحریکِ حُریّت کے مناظر سنگِ تراشی کے اعلیٰ نمونوں کی صورت میں نصب ہیں۔ بندوق، کلہاڑی، ہل، ہتھوڑا، درانتی اور پرچم اُٹھائے ہُوئے حُریّت پسند مرد و زن ایک تنظیم ایک ترتیب میں اپنے نصبُ العین کی جانب بڑھتے دکھائی دیتے ہیں۔ ماؤ ہال میں داخل ہوں تو سامنے ماؤ کا سفید فام مجسّمہ کُرسی پر بیٹھے مُسکراتے ہوئے استقبال کرتا ہے۔ اس مجسّمہ کے دونوں جانب سے راستہ عقبی ہال میں جاتا ہے۔ جہاں درمیان میں شیشے کے تقریبًا ۸ × ۱۲ مستطیل شوکیس میں ماؤ کی حنوط شُدہ لاش پڑی ہے۔ چیئرمین ماؤ سیدھے لیٹے ہُوئے، آسمان کو دیکھتے ہُوئے، سُرخ کمبل شانوں تک ہے۔ ماؤ کے چہرے کی سیدھ میں چھت میں روشنی کے لیے مربع شکل میں روشن دان ہے۔ شوکیس کے چاروں طرف سُرخ رنگ گملوں میں سُرخ للی کے پھُول کھِلے ہیں۔ دونوں طرف سے غیر ملکی اور ملکی زائرین آہستہ آہستہ ماؤ کی زیارت کرتے گزرتے جاتے ہیں۔ کوئی رُکتا نہیں اور شاید اسی لیے بعض

چینی زائرین کی ہچکیاں اور سسکیاں بھی نہیں رُکتی ہیں۔ سرد آہوں کی سائیں سائیں میں آگے گزر جاتا ہوں اور ہال سے باہر نکل کر ایک طرف کھڑا ہو جاتا ہوں۔ دل اور دماغ میں بہت کچھ یک دم اور یک لخت اُبھر آیا ہے۔ کوئی ترتیب ان سب میں نہیں ہے۔ مگر ایک احساس کی ڈوری ان سب کو پرو رہی ہے جیسے بہت سارے مختلف گیت اپنے اپنے آہنگ کے ساتھ ایک گیت میں ڈھل رہے ہوں۔

رنگ، لفظ، خوشبو، سوچ، صدا، سُر، سب امانت ہیں مُبارک ہیں وہ لوگ جو امین کہلاتے، جن کے حرف صحیفوں میں سُر سماعت میں نعرے فضا میں اور جن کے رنگ منظروں میں ہیں۔ معرکۂ وجود میں جن کے گھوڑوں کے سُموں سے اُٹھنے والی گرد کی قسم کھائی گئی ہے۔ جن کے قلم، عَلم، سیف و ساز دلوں کے عجائب گھر میں عہد بہ عہد سجائے جاتے ہیں وہ سب جو چراغ لے کر اندھیروں میں چلے، وہ سب جو شہید ہوئے، سچائی کی تلاش سرخرو ہُوئے، وہ سب جو غازی ہیں ـــــ انھیں یاد کریں سلام کریں کہ نسلِ نو کا لاشعور اُلجھنوں سے پاک رہے اور شعور علمِ خیر سے فیضیاب ہو اور دشتِ سفر میں نخلِ آگہی اُبھرے جس کے سامنے ہی ہر قسم کے استحصال سے نجات ملتی ہے۔ جہاں نور تیرگی پہ غالب آتا ہے اور خزاں بہار سے مات کھاتی ہے۔ سُر قائم ہوتا ہے۔ سکوت صدا سے زیر ہوتا اور اسمِ اعظم کی گمشدہ میراث واپس ملتی ہے۔ تب آسمان درِ ابرِ مُراد کھولتا ہے اور زمین وہ سب نعمتیں اُگلتی ہے۔ جن کا وعدہ کیا گیا ہے۔

۱۰
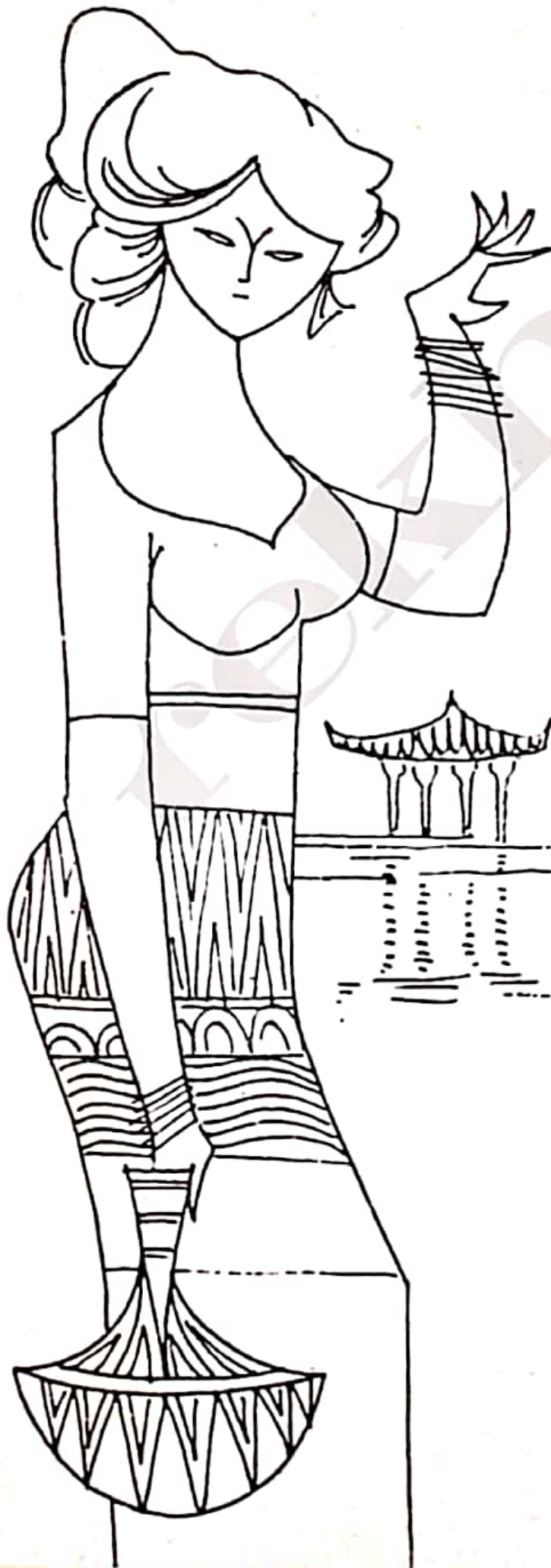
۱۲/۱/۲ بج گئے اور مَیں چینی ساتھیوں کے ساتھ قریب ہی بیجنگ ڈک رسیٹورنٹ میں پہنچ گیا۔ جہاں چینی وزیرِ ثقافت پاکستانی وفد کو دوپہر کا کھانا دے رہے تھے۔ بیجنگ ڈک مشہور زمانہ ہے اور بیجنگ ڈک رسٹوران میں دُنیا بھر سے لوگ بطخ کھانے آتے ہیں۔ یہ بطخ ایک خاص انداز میں پرورش کی جاتی ہے۔ جس کا گوشت نہایت خستہ اور لذیذ ہوتا ہے۔

باقی حضرات بھی پہنچ چکے تھے۔ کھانا شروع ہوا۔ کھا کھا کر اور پی پی کر بےحال ہونے لگے تو ایک حسینہ ٹرے میں سالم بطخ بُھنی ہوئی سجا کر لائی اور دعوتِ نظارۂ مرغکِ بیچارہ دینے لگی۔ یہ بطخ کی رونمائی تھی اور جو کچھ کھا چکے تھے۔ وہ تو صرف بھوک چمکانے کا سامان تھا —— پھر کورسز چلے اور چلتے رہے اور وہ خاص ڈش جب آئی جس میں بطخ کی چونچ پائینچے سرا در ٹانگیں تھیں۔ تو غنودگی چھانے لگی کیونکہ پلیٹ میں بطخ کے سر میں جڑی دو آنکھیں کہتی تھیں

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

تب ہم نے ہاتھ میں جوس کا گلاس تھاما۔ سگریٹ سلگایا اور کش لے کر

دھوئیں کے مرغولے چھوڑے اور چینی میزبانوں سے باتیں کرنے لگے۔ ایک چینی مُسلمان سے جو کافی اچھے عُہدے پر ہے۔ تعارف ہُوا اور تعارف ہوتے ہی وہ شاعر بھی نکل آیا اور جھٹ سے ایک نظم جو اس نے بقول اُس کے ابھی اُسی وقت ہمارے استقبال میں کہی تھی۔ سُنا ڈالی۔ اور ہمیں یقین ہو گیا کہ یہ بھلا مانس واقعی مُسلمان ہے۔ نظم کا نام شاہراہِ ریشم تھا۔ کامریڈ شان نے ترجمہ سُنایا تو پتہ چلا شاہراہِ ریشم کتنی طویل ہے۔

ساڑھے تین بجے گریٹ ہال میں وائس چیئرمین سٹینڈنگ کمیٹی بمع چینی ثقافتی ٹیم کے ساتھ پھر مذاکرات ہوئے۔ ثقافتی مسائل اور پروگرام کا ذکر ہوا۔ نئے عزائم اور ارادوں کا تبادلہ ہوا۔ سفارشات تیار ہوئیں —— پھر دوستی جا بجیت زیرِ بحث آئی اور افغانستان کا ذکر ہُوا۔ تو وائس چیئرمین نے کُرسی سے اُٹھ کر غُصّے میں لال پیلا ہو کر مُکّہ میز پر مارا اور کہا۔

" ہمارے دوست پاکستان پر کسی بھی طرف سے اگر بالا دستی تھوپنے کی کوشش کی گئی تو ایک سو کروڑ چینی عوام پاکستانیوں کے شانہ بشانہ لڑیں گے۔"

جاپان کے ساتھ چینی برآمدات کا ذکر ہوا تو چینی برادران میزانیہ ہندسوں پر ایک نہ تھے۔ ایک بار کوشش پھر کوشش اور ہر کوشش ناکام۔ بالآخر چینی دوست یہ قصّہ گول کر گئے۔ تو میں نے کامریڈ کے کان میں کہا۔

پاک چین دوستی کی بنیادیں ریاضی میں دونوں قوموں کی کمزوری بھی ایک قدرِ مشترک ہے اور کامریڈ لن نے اس سے بھی اتفاق کر لیا۔

بھاری بھر کم مذاکرات کے بعد ہلکے پُھلکے موضوعات چھڑے۔ پاکستان کی ایک فلم، میرا نام ہے محبت، جو یہاں پچھلے دنوں دکھائی گئی تھی۔ اُس کی تعریف وائس چیئرمین نے بھی کی۔

پھر اچانک ایک قہقہہ چینیوں میں درجہ بدرجہ اُترتا ہُوا مترجم کامریڈ شان تک پہنچا تو اس نے مُنہ کھول کر قہقہہ آگے بڑھایا اور وفورِ مسرت میں اپنا ہاتھ وائس چیئرمین کے ہاتھ پر دے مارا۔ وائس چیئرمین نے اپنا ہاتھ انگریزی کی مترجم فتنۂ ثقافت کے نازک ہاتھ پر مار کر یہ ثابت کر دیا کہ چینی دُکھ درد اور مسرت میں نہایت سادہ اور بے تکلف ہوتے ہیں۔ پھر جامِ صحت ہر دو جانب سے تجویز ہُوئے اور ارباب نیاز نے "میرا نام ہے محبت" جیسی اور فلمیں بھجوانے کا وعدہ کیا۔

اس کے بعد میری ایک پینٹنگ (خطاطی) پاکستانی وفد کی جانب سے وائس چیئرمین کو تحفہ میں دی گئی۔ جس پر لکھا تھا "ھُوَالحیُّ القیوم" وائس چیئرمین نے تپاک سے میرا ہاتھ دبایا اور تحسین آمیز کلمات کہے۔

گریٹ ہال سے نکلے تو سپورٹس کامپلکس بیجنگ پہنچے۔ راستے میں دارالحکومت کے در و دیوار کا نظارہ کرنے کا اچھا موقع ہاتھ آیا۔ رہائشی کوٹھیاں اور فلیٹس اور اپارٹمنٹس خوب صورت مگر سادہ ــــ صاف ستھرا ماحول ہرا بھرا۔ جدید یورپی طرزِ تعمیر کا بھی اثر نفوذ ہو رہا ہے۔ مگر زیب و زینت کے باب میں چینی سادگی و پُرکاری کا عنصر حاوی ہے۔ ہمارے اسلام آباد کا سا عالم نہیں ہے جہاں بنگلے اور کوٹھیاں معماروں اور مزدوروں کی بجائے کسی بیکری کے بنے ہُوئے کیک اور پیسٹریاں دکھائی دیتے ہیں۔

سپورٹس کمپلکس میں داخل ہُوتے ہوتے شام ہو گئی۔ پندرہ سو تماشائیوں کے لیے نشستوں کے انتظام والی اِس خوبصورت اور جدید بازی گاہ میں روشنی اور آواز کا سسٹم بہت عُمدہ اور جدید ہے۔ فرش پر برف جمائی جا رہی تھی اور چھت پر روشنیاں چاند ستاروں اور کہکشاں کی صورت میں جیسے

چینی شعوری طور پر آسمان کو زمین پر اُتارنا چاہتے ہیں۔ نہ معلوم یہ جذبۂ تقابل ہے یا لاشعوری سطح پر گمشدگی کا احساس۔

یہاں سے تیز تیز بیجنگ فرینڈشپ سٹور کو چلے۔ بیگم ارباب نیاز کو ڈرائیور کی سُست روی پر بہت غصّہ آرہا تھا۔ بہرحال پہنچ گئے فرینڈشپ اسٹور کئی فلوروں پر مشتمل ہے اور دُنیا بھر کی اشیاء یہاں پر دستیاب ہیں ——— پہلے کرنسی بدلوائی۔ ڈالرز کے عوض یوآن۔ ماؤ اور فلس لیے اور فرینڈشپ سٹور کی سیر کرنے لگے۔ سب بچھڑ گئے مگر چینی میزبانوں کا کمال تھا کہ ہر ایک کے ساتھ ایک ایک ضرور رہا۔ ملبوسات، پارچات، نوادرات مصنوعات بہت کچھ خریدنے کو جی چاہتا تھا۔ مگر سب کچھ خریدا نہیں جاسکتا اور فرینڈشپ سٹور پر غیرملکیوں کے لیے کچھ خریدنا اور بھی دشوار ہے۔ رش اس قدر ہوتا ہے کہ سفید ماؤ کیپ جیکٹ اور پینٹ پوش چینی سیلز گرل اگرچہ کافی تعداد میں ہر کاؤنٹر پر ہوتی ہیں پھر بھی باری نہیں آتی اور چونکہ غیرملکی اُن سے بات مترجم کے ذریعے سے ہی کرسکتے ہیں۔ اِس لیے وہ ایک کو ریٹ دوسرے کو سائز تیسرے سے نقدی وصول کرتی چوتھے کو رسید دیتی اور پانچویں کے لیے پیکنگ کرتی ہوئی بے حد مصروف ہوتی ہیں۔ اس کا یہ حل سوچا کہ کم از کم سیلز گرل کو بُلانے کے لیے تو کامریڈشان سے چھٹکارا پایا جائے۔ ہم نے کامریڈ سے لڑکی کو بُلانے کے لیے چینی زبان کے الفاظ پوچھے۔

"سَے سَے۔" کامریڈ بولا۔

بالکل ٹھیک ہے کامریڈ سَے سَے، لیلا، سیلیٰ یہ تو ہم نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر اور نجد کے صحراؤں سے چینی مرغزاروں تک پکار سکتے ہیں پھر اس عاشقی میں۔ ۱۵ یوآن خرچ کر کے واپس اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس آگئے۔ کھانا کھایا اور سو گئے۔

穆罕默德·阿斯拉姆·卡玛尔先生

١١

۱۵ر نومبر کی صُبح ناشتہ کیا اور دیوارِ چین دیکھنے روانہ ہوئے۔ بیجنگ کے بازاروں اور سائیکلوں کے سیلاب سے گزُرتے ہوئے کچھ دیر بعد ہم شہر سے نکل کر مضافات میں داخل ہو گئے۔ تاحدِنظر دونوں جانب کھیت۔ کھیتوں میں بوائی ہو چکی ہے۔ فصل ابھی اُگی نہیں اِس لیے بیجنگ کے مضافات میں ابھی ہریالی زیادہ دکھائی نہیں دیتی ہے۔ سڑک کے دو رویہ درخت خشک موسم کی وجہ سے کچھ کچھ گرد آلود دگرنہ چین میں گرد نام کو بھی نہیں ہوتی۔ سڑک پر ٹرک ٹرالیاں ٹریلر اور ریڑھے، بلڈوزر اور ٹریکٹر قطار اندر قطار آتے جاتے ہیں۔ ڈرائیور زیادہ تر عورتیں ہیں جو چین میں ہر محنت ہر مشقت میں برابر کی حصّہ دار ہیں یہاں تک کہ راہ میں ایک برساتی نالے پر زیرِتعمیر پُل پر چُنائی کرتی اور پتھر اٹھاتی کرلاتی عورتیں ہم دیکھتے ہیں۔ جن کی نازک کلائیوں حنائی اُنگلیوں اور پتلی کمر سے شاعری کے دیوان روشن ہوتے ہیں۔ بیجنگ کے مضافات میں باغات کم اور کارخانے فیکٹریاں، زیادہ دکھائی دیتے ہیں اور شہر کے کئی منزلہ رہائشی اپارٹمنٹس کا سلسلہ اب گارے اور مٹی سے بنے ہُوئے دیہاتوں کی جانب دراز ہوتا جارہا ہے۔ کاشت کاری میں ایک

قومی جذبہ ایک قومی انہماک بڑا واضح دکھائی دیتا ہے۔ نوخیز فصلوں کو موسموں کی شدت سے محفوظ کرنے کے لیے قطار اندر قطار پولیتھن کی چھتریاں استعمال کی جاتی ہیں۔

ڈیڑھ گھنٹے بعد کامریڈ شان نے سامنے پہاڑی سلسلہ کی جانب اشارہ کر کے کہا۔ دیوارِ چین۔

دیوارِ چین جو ساتویں کے نصاب میں پڑھی تھی اور خلا سے کرۂ ارض کی واحد قابلِ شناخت چیز دیوارِ چین ہے۔ پھر ساتویں جماعت کے طالب علم کی طرح ہاتھوں میں چہرہ تھام کر پُر اشتیاق آنکھوں سے دیوار کو دیکھتا ہوں کہ کب دیوارِ چین آئے۔ جس پر میں اُچھلوں کودوں۔ جوں جوں دیوارِ چین کے قریب جا رہے ہیں۔ اگر غلط سلط پڑھا ہوا جغرافیہ اور جھوٹی سچی تاریخ ذہن سے نکل جائے۔ سمت کا تعین گم ہو جائے تو یوں لگتا ہے جیسے ہم پشاور سے جمرود اور پھر آگے۔ درۂ خیبر میں داخل ہو رہے ہیں۔ وہی درۂ خیبر کی طرح ایک جانب سڑک اور وہ بھی بائیں جانب۔ بیچ میں پانی کی گزرگاہ اور مخالف سمت میں ریلوے لائن۔ چڑھائی چڑھتی سڑک پر اُونچائیاں اور اترائیاں بالکل ویسی ہی پُرخطر اور دشوار گزار ہیں۔ البتہ چینیوں نے اندھے موڑوں پر آئینے نصب کر کے مقابل سے آنے والی ٹریفک کو سمجھنا آسان کر دیا ہے۔ درۂ خیبر کے پہاڑ خشک ہیں۔ یہاں خشک نہیں۔ گھاس ہے جھاڑیاں اور درخت ہیں۔ مگر یہ سب مل کر اس حُسن کا مقابلہ نہیں کرتے جو درۂ خیبر کے خشک پتھروں کے نصیب میں ہے۔ جہاں سے دیوارِ چین کو ہم دیکھنے والے ہیں۔ یہ بھی ایک درّہ ہے جس کا نام شان ہائی پاس ہے اور بیجنگ کی حفاظت کے لیے یہ دیوار اس کو کاٹتی یا بند کرتی یہاں سے گزرتی ہے۔ یہاں بھی بالکل وہی منظر ہے طُور خم

بارڈر والا - بائیں جانب ویسے چینی نوادرات کی دُکانیں، چائے خانے اور بس سٹینڈ ہیں۔

دیوارِ چین کی سیر شروع ہوتی ہے۔ ایک زینے سے چڑھ کر دیوار میں داخل ہوئے۔ دیوار ایک سڑک ہے۔ جس میں اَن گنت انسان چڑھ کر گولے بارود اور خورد و نوش کے سامان سے لدے ہُوئے ریڑھے کھینچا کرتے تھے۔ اور یوں اگلے مورچوں میں لڑتی فوج کو سامانِ رسد پہنچتا تھا۔ دیوارِ چین جو آٹھ عجائبات عالم میں سے ایک ہے۔ تقریباً ۷۰۰ برس قبل مسیح دفاعی نوعیت کے مختلف مقامات پر حصّوں میں بنائی گئی - ۲۲۱ قبل از مسیح میں کِن خاندان کے دورِ حکومت میں اس کے حِصّوں کو آپس میں ملا دیا گیا۔ گویا منگ خاندان کو (۱۴۰۰ء) عیسوی میں پہلی بار یہ دیوار پوری کی پوری تیار ملی - یہ موجودہ چین کے سات صوبوں کو عبور کرتی ہے۔ اس کی بنیادوں میں پتھروں کی بھاری اور لمبی سلیں ہیں اور بالائی حصّہ لمبی اینٹوں سے تعمیر کیا گیا ہے دونوں جانب تقریباً ایک میٹر بلند حفاظتی دیواریں ہیں۔ اندرونی حفاظتی دیوار مسلسل اور بیرونی حفاظتی دیواریں حملہ آور پر حملہ آور ہونے کے لیے رخنے ہیں۔ تقریباً دو سو میٹر کے فاصلے پر باقاعدہ چوکیاں ہیں۔ دیوارِ چین کی اونچائی تقریباً سات آٹھ میٹر ہے اور چوڑائی تقریباً پانچ اور چھ میٹر کے قریب ہے۔

مَیں اِس دیوار کو دیکھتا ہُوا بہت آگے نکل گیا اور بہت اونچائی پر پہنچ گیا یہاں تک کہ چینیوں سے بھی چھٹکارا مل گیا۔ مَیں اس کو ہر نشیب میں اترتا اور ہر فراز پر سے گزرتا دیکھتا ہوں۔ ٹھنڈی یخ ہَوا بہت تیز ہے۔ مگر سیاحوں کا ایک ہجوم ہے۔ پھر مَیں نیچے اُس مقام کو دیکھتا ہوں جہاں سے سیاحوں کی سیر شروع ہوتی ہے۔ یہ دیوار ایک لمبی روش لگتی ہے پھُولوں سے بھری ہُوئی

نیلے پیلے سفید کالے سبز سُرخ ملبوسات غیر ملکوں کے بالکل انار کلی کی بھیڑ جیسے لگتے ہیں پیشہ ور فوٹو گرافر بوڑھی میموں اور فلیٹ ہیٹ اور سوٹ بوٹ میں ملبوس چھڑیاں ٹیکتے چلتے سیاحوں کی تصویریں بنا رہے ہیں۔ مَیں اِس دیوار کا ایک بار بھرپور نظارہ کرنا چاہتا ہوں۔ جی چاہتا ہے۔ یہ منظر اپنی ساری تفصیلات کے ساتھ میرے حافظے پر نقش ہو جائے دفاعی نقطۂ نظر سے بنائی گئی اس دیوار کے شکوہ کا یہ اعجاز ہے انسان کے ذہن سے یہی دفاعی نقطۂ نظر بالکل نکل جاتا ہے۔ دیوارِ چین کو انتہائی بلندی سے نیچے آتا دیکھیں تو ایسے لگتا ہے جیسے آسمان میں کوئی دروازہ کھلا ہے۔ اور دروازے سے کوئی زینہ زمین کی جانب اُترتا ہے۔ جو نشیب میں سے گزر کر فراز کی جانب لپکتا ہُوا پھر بادلوں میں غائب ہو جاتا ہے۔ یوں اس دیوار کا زیر و بم دیوار کے تصوّر کو نفاق، دشمنی، رقابت، ہوس، حسد اور سازش کی چار دیواری سے بلند کر کے ایک نئی غنائیت سے بہرہ ور کرتا ایک انوکھے تناظر سے ہمکنار کرتا ہُوا تصویر نغمہ اور تخیّل کی سطح پر لے جاتا ہے۔

دیوارِ چین ایک جھولا ہے۔ جسے انسان سرخوشی میں جھولتا ہے۔ اور عالمِ بے خودی میں آسمانی گیت گانے لگتا ہے۔ هو الله الذی لا اله الا هو علم الغيب والشهادة هو الرحمٰن الرحيم ٥

کوئی دو سو گز پیچھے ڈھلوان پر کھڑا آغا ناصر میری طرف دیکھ رہا ہے۔ اور اشارے سے مجھے واپس بُلا رہا ہے۔

اسلم کمال واپس آجاؤ۔ ساتویں جماعت کے کھلنڈرے طالب علم تاریخ کی کتاب کے اپنے صفحے پر چلے آؤ۔ دل اس مراجعت پر آمادہ نہ تھا۔ مگر دل جسم کا قیدی ہے اور جسم شرطِ سفر کا پابند تھا۔ رفعتوں سے اُتر آیا۔

یہ دیوار ایک داستان ہے۔ کلیلہ دمنہ جیسی کوئی کہانی در کہانی ہے۔ چینی طرزِ زندگی کی کہانی — چینی طرزِ فکر کی کہانی — چینی طرزِ جنگ کی کہانی۔ کہانی جو چینی طرزِ اظہار کی علامت بن کر پستیوں اور رفعتوں میں اُترتی چڑھتی ہے۔ یہ دیوار ایک اژدھا ہے۔ یہ دیوار ایک خطِ تسخیر ہے۔ جسے دستِ انسان نے کھینچا ہے۔ میری چشمِ تخیل روایتی چینی مصوری کے پس منظر میں اُبھرنے ڈوبنے لگتی ہے۔ اور چینی مصور کو اترائیوں میں پھسلتے اور اُونچائیوں پر لپکتے دیکھتی ہے۔ جس کے فن پاروں میں بادلوں سے پہاڑ جُدا ہوتے دُھند سے جنگل اُبھرتے اور جنگلوں سے دریا نکلتے دیکھتی ہے۔ بادلوں کی نمی، جنگلوں کا بھید، پہاڑوں کا استقلال اور دریاؤں کی نغمگی چینی مصوروں کو ان اترائیوں میں پھسلنے اور ان اونچائیوں پر لپکنے سے ہاتھ آتی ہے۔

کامریڈ کمال بریو۔ بریو۔

مَیں چونک کر مادام جنگ اور مس چن کی جانب دیکھتا ہوں اور کامریڈ شان بتاتا ہے۔

یہ آپ کو بریو (بہادر) کہہ رہی ہیں۔ آپ اتنی دُور اتنی بلندی پر چلے گئے تھے۔

مَیں نے خاتون کا شکریہ اَدا کیا اور کہا بہادری ہم پاکستانیوں کی سرشت میں ہے۔ دیوار پر ہم فوراً چڑھ جاتے ہیں اور بے ساختہ قہقہہ لگاتے ہیں۔ ہمپٹی ڈمپٹی کی کہانی بھی ہمارے انگلش میڈیم سکولوں میں پڑھائی جاتی ہے۔

دیوار سے نیچے اُتر کر ایک کیفے میں چائے پی۔ کاروں میں بیٹھے اور دیوارِ چین کو مُڑ مُڑ کر دیکھتے ہُوئے واپس روانہ ہُوئے۔

سڑک کے دونوں جانب تاحدِ نظر میدانی علاقہ، کھیت اور ندی نالے اور چھوٹے چھوٹے گاؤں بانس کے جھنڈوں میں، راستے میں منگ قبرستان دکھایا جاتے گا۔ اور ہم بڑی سڑک سے نکلتی ہوئی ایک چھوٹی سڑک پر ہو لیے۔ پھر ایک گیٹ وے سے گزرے۔ پھر دوسرے گیٹ وے سے اور آگے سڑک کے دونوں کناروں پر ہاتھی، شیر، ہرن، بیل، گھوڑا، اژدہا اور کچھوا کے دیوہیکل مجسمے مؤدب سجاتے گئے ہیں۔ یہ آنجہانی شہنشاہ کی قبر کے راستے میں آخری دیدار کے لیے ایستادہ ہیں۔ پھر ایک گیٹ وے سے گزرے تو سڑک کے دونوں جانب امیر وزیر سفیر دبیر دانشور اور فنکاروں کے مجسمے مؤدب آنجہانی کے آخری دیدار کے لیے کھڑے ہیں۔ ایک اور گیٹ وے سے گزر کر گاڑیاں کافی دیر بھاگتی رہیں۔ تب ایک پُر رونق مقام آیا۔ یہ منگ قبرستان ہے۔ ایک دیوہیکل کچھوے پر ایک لاٹھ ہے۔ اور لاٹھ پر ایک تختی پر کچھ لکھا ہے۔ جو یقیناً آنجہانی شہنشاہ کے بارے میں ہے۔

(۱۶۴۴ - ۱۴۰۳) منگ خاندان نے اپنا دارالحکومت بیکنگ بنایا۔ اور ۱۳ منگ شہنشاہوں نے شمال مغربی مضافات میں اپنے قبرستان بنوائے۔ یہ قبرستان جس کی سیر کرنے والے ہیں۔ تیسرے منگ بادشاہ چاؤلی کا ہے۔ سات کلومیٹر لمبی سڑک جس پر پتھر کے بنے ہوئے چار گیٹ ہیں۔ اور جن میں سڑک کے دونوں جانب جانور اور انسانوں کے مجسمے کھڑے ہیں۔ یہ مقدس راستہ اس قبرستان کا ہے اور یہ قبرستان تین حصّوں میں ہے۔ باغِ بہشت پہلا حصّہ ہے۔ یہ ایک ہال ہے۔ جو ۱۴۲۷ء میں بنا اور چین میں لکڑی سے بنی ہوئی سب سے بڑی عمارت ہے۔ اس کا رقبہ ۱۹۰۰ مربع میٹر ہے۔ اس ہال کے پیچھے ایک دو منزلہ مینار ہے۔ یہ رُوح کی آرام گاہ ہے۔ یہاں بادشاہ چاؤلی

کا پتھر کا تعویذ ہے۔ اِس کے پیچھے ایک اور باغِ جنت ہے۔ جس کے گرد فصیل ہے۔ یہ فصیل دیوارِ چین کا منی ایچر ماڈل ہے۔

اِس باغِ جنت کے نیچے دو منزلہ تہ خانہ ہے۔ جہاں بادشاہ چاؤلی کا تابوت ہے اس کے ایک طرف اس کی ملکہ کا اور دوسری طرف داشتہ کا تابوت ہے۔ یہ دو منزلہ تہ خانہ تقریباً ۲۷ میٹر گہرا ہے۔ جس میں سامنے درمیان میں عقب میں دائیں اور بائیں پانچ ہال ہیں۔ یہ زیرِ زمین محل تمام کا تمام پتھّر سے تعمیر کردہ ہے۔ جس میں ایک بھی کالم یا بیم کا استعمال نہیں کیا گیا عقبی ہال میں شہنشاہ اس کی ملکہ اور داشتہ کے صندوق پڑے ہیں۔ جن میں ہیرے جواہرات بھرے پڑے تھے۔

منگ خاندان کے سترہ بادشاہ تھے۔ تیرہ نے بیکنگ کے مضافات میں چالیس مربع کلومیٹر ہی کے رقبے میں اپنے قبرستان بنوائے باقی چار اپنے قبرستان نہ بنوا سکے۔ کیونکہ ایک کو قتل کر دیا گیا۔ ایک نے پھندا گلے میں ڈال کر اپنا کام تمام کر لیا۔ ایک کو پھانسی پر لٹکا کر راہی مُلکِ عدم کیا گیا اور چوتھے نے خودکشی کر لی۔ خودکشی کا طریقہ نہیں معلوم ہو سکا۔ تیرہ قبرستانوں کا کھوج لگا لیا گیا ہے۔ مگر کھدائی ابھی اسی ایک قبرستان کی ہوئی ہے۔ شہنشاہ چاؤلی نے باغِ بہشت بنوایا۔ رُوح کے آرام کے لیے مینار بنوایا۔ پھر بھی تسلی نہ ہوئی تو ایک اور باغِ جنّت فصیل کے حصار میں بنوایا، منگ چاؤلی کا یہ قبرستان مصری فرعونوں اور نمرودوں جیسا ہے۔ انسان جتنا چاہے بھاگے اور اپنی دانست میں بھاگ بھی نکلے مگر اللہ میاں کے تصوّر جنّت سے دامن نہیں چھڑا سکا نہ آج سے پہلے نہ آج تک اور شاید نہ آج کے بعد بھی۔ یہ سارا قبرستان کروڑوں مزدوروں نے دن رات ایک کر کے تعمیر کیا اور نہایت پوشیدہ طور پر اس کی تعمیر ہوئی۔ یہاں

بنائی جانے والی کہانیوں کے مطابق تمام کاریگر یا گونگے چنے جاتے تھے یا اُن سے مطلب براری کے بعد اُن کو گونگا کر دیا جاتا تھا۔ اُن کی قوتِ گویائی چھین کر مطلق الحکم شہنشاہ نے عافیت پائی ہو گی کہ اُس کا تابوت اس کی داشتائیں اور ہیرے جواہرات سب زیرِ زمین دُنیا کی آنکھ سے اوجھل رہیں گے۔ لیکن جس طرح چاؤلی کی لاش اس کی ملکہ اور داشتاؤں کی لاشیں اور اُن کے ساتھ ہیرے جواہرات پوشیدہ نہیں رہ سکے۔ اسی طرح سلب شدہ قوتِ گویائی کھنڈرات کی زبان بن کر تاریخ سے مکالمہ کرنے لگی ہے۔ عقبی ہال یعنی تابوت گاہ میں پہنچے تو دیکھا مرکز میں تابوت ہے۔ چاؤلی منگ بادشاہ کا۔ دائیں جانب ہے اُس کی ملکہ کا اور بائیں جانب تابوت ہے۔ اُس کی ایک بہت پیاری داشتہ کا۔ ملکہ اور داشتہ اپنے اپنے مرتبے کے لحاظ سے دائیں اور بائیں پہلو میں دفن تھیں ملکہ بے اولاد تھی مگر داشتہ آید بکار یعنی اس نے لڑکا جنا جو بادشاہ اور ملکہ اور اپنی ماں کے مرنے کے بعد تخت نشین ہوا تو داشتہ کی لاش ملکہ کے صندوق میں اور ملکہ کی لاش داشتہ والے صندوق میں منتقل کر دی گئی۔

استفسار کرنے پر بتایا گیا کہ اب ان صندوقوں میں لاشیں نہیں ہیں۔ جس طرح آزدبازو میں دیگر چوبی صندوقوں میں ہیرے جواہرات نہیں رہے۔ انسان بھی عجیب ناقص العقل ہے۔ قفسِ عنصری سے رُوح کی پرواز کا ایک محض تصوّر رکھتا ہے۔ حالانکہ چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں اور قفسِ عنصری قفسِ چوبیں سے بھی بدل سکتا ہے۔ یہ مرحلہ انسان کی ناقص عقل میں ابھی تک نہیں آیا۔

مزید استفسار کرنے پر کہ منگ شہنشاہ کا قفسِ عنصری کہاں گیا۔ ہیرے

جواہرات تو سمجھ میں آتے ہیں کہ کہیں ضرور پہنچ گئے ہوں گے۔

بتایا گیا کہ اُوپر میوزیم میں پتہ چلے گا۔

اوپر میوزیم میں آتے تو وہاں پر تاج، جوتے، کپڑے، تصویریں، برتن اور ملکاؤں، داشتاؤں کے زیورات، ملبوسات، سامان آرائش وغیرہ وغیرہ سب نہایت سلیقے سے شوکیسوں میں زیرِ نمائش ہیں۔ اور ایک کونے میں ایک مکروہ انسانی ڈھانچہ کا بلیک اینڈ وائٹ فوٹوگراف دلوں کو دھڑکاتا اور ہولا تا کرتا تھا۔ ہمت کرکے پوچھا تو بتایا گیا۔

شہنشاہ چاؤلی کا ڈھانچہ ہے۔

یہ تو فوٹوگراف ہے۔ صاحبِ تصویر ڈھانچہ کہاں ہے؟ چینی بھائی اسے شاید آنجہانی چاؤلی کی خواہش کے احترام میں ہمیشہ پوشیدہ رکھنے پر مصر تھے۔ لاعلمی کا اظہار کیا گیا تو میں نے پلٹ کر چینی مصوروں کی تخلیق کردہ منگ شہنشاہوں اور اُن کی ملکاؤں اور داشتاؤں کی تصاویر پر توجہ مرکوز کی۔ چینی گائیڈ کا چھلانگ مارنا اور ایک ایک چھلانگ صدیاں عبور کرتی ہوئی اور انقلاب کے گنتی کے سال سلوموشن میں دیکھتے رہنے سے کہیں زیادہ بہتر سمجھا کہ آنکھ جو دیکھتی ہے۔ دیکھنے جادو گوشِ سماعت پہ بار گزرتی آوازوں کو دوسرے کان سے نکال کر حسنِ سماعت کو جگاتی صداؤں پر توجہ دینے سے تاریخی شعور کی پرورش ہوتی ہے۔

شہنشاہ اپنی مملکت کے ایک ایک اِنچ کے لیے اپنی رعایا کا آخری فرد بھی کٹوانے کو تیار رہتے ہیں۔ مگر شہنشاہی مزاج کسی حد کسی سرحد کا پابند نہیں ہوتا۔ کرہ ارض پہ اس کی ایک جیسی خاصیت ہے۔ آفاقی مزاج ہے۔ لیکن چینی مطلق الحکم بادشاہوں کی تصویریں دیکھ کر اس آفاقیت کو دھچکا سا لگتا ہے۔

ظالم، جابر، فاسق اور فاجر کی عالمگیر نشانیوں میں سے کوئی بھی نشانی ان چینی حکمرانوں کے خدوخال میں نہیں ہے نہ بڑی بڑی مونچھیں، نہ خوفناک ڈاڑھی نہ خونخوار آنکھیں، نہ قاتل گہری بھنویں، نہ موٹے آدم خور ہونٹ، نہ سخت گیر ٹھوڑی، نہ گردن سؤر کی سی اور نہ تنور جیسی تو ند۔ یہ تو منحنی سے ہیں۔ خوفناک مونچھیں اور ڈاڑھی زرد نسل کے مقدر میں ہی نہیں۔ گردن صراحی دار ہوتی ہے، اور تو ند کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ ان سب باتوں کے اُلٹ عالم پناہ کی پُشت پر لمبی سی بل کھاتی چٹیا بھی لٹکتی ہے۔ یہ کیسے ظالم تھے کہ ظالموں جیسے نہیں ہیں جب یہ سوال ذہن میں اُبھرا تو وہ اوراق جن پر مظلوموں کی آہیں اور چیخیں رقم تھیں اور جن کو تاریخ نے اسی مظلومیت کے باوصف دھتکار دیا تھا۔ پھڑ پھڑا کر آنکھوں میں تیرنے لگے۔ کروڑہا گونگوں کا انبوہ میرے سامنے تھا۔ وہ جو گونگے تھے۔ مگر گونگے نہ لگتے تھے۔ بالکل اُسی طرح کہ جو ظالم تھے مگر ظالم لگتے نہیں ہیں اور جو ظالم ہو مگر ظالم دکھائی نہ دیتا ہو۔ تو جان لو اُس کا ظلم جسموں سے بہت آگے دلوں کو گھیرنے والا روحوں کو کچلنے اور خوابوں کو مسلنے والا ہوتا ہے۔ پس انقلاب سے پہلے دیوارِ چین فراز ہے۔ پیکنگ سطح مرتفع اور نشیب منگ قبرستان ہے۔

بیجنگ واپس پہنچے۔ رات کو ارباب نیاز نے چینیوں کو عشائیہ دیا پاکستانی ایمبیسی میں۔ یہاں پاکستانیوں نے بھی قورمے پلاؤ بریانی کے کورس چلائے مگر وہ بات کہاں چینیوں والی۔

واپس اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس پہنچے۔ ہوا تیز ہو کر آندھی کی صورت اختیار کر رہی تھی۔ گرم پانی سے غسل کیا۔ ٹھنڈا اورنج جوس پیا۔ مختار احمد سے ٹیلیفون پر گپ شپ ہوتی اور دوبارہ کینٹن سے بیجنگ واپسی پر ملاقات کا وعدہ کیا اور سو گئے۔

۱۶ر نومبر کی صُبح بہت جلدی بیدار ہوگیا۔ یہ رات بڑی بے چینی میں کٹی ۔ بار بار آنکھ کُھل جاتی اور نیند گہری نہ ہو سکی۔ بدن میں تھکن کا زہر سا گھُلا ہوا تھا۔ جسے زائل کرنے کے لیے پورا ایک گھنٹہ گرم پانی کے ٹب میں لیٹا رہا۔ پھر شیو کی ۔ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی ۔

ویٹرس اندر آئی ۔

سر۔ کافی ۔

پھر مَیں کمرے میں گھومتا ہُوا کافی کی چسکیاں لینے لگا۔ کافی کا تلخ ذائقہ مزا دے رہا تھا۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ ریسیور اُٹھایا سر پورٹر آرہا ہے ۔سامان دے دیں اور ناشتہ کے لیے آجائیں ۔

ٹھیک ہے ۔ لے جائے ۔

مَیں نے جواب دیا اور ریسیور رکھ دیا۔ ہم آج شینگ ہائی روانہ ہو رہے ہیں ۔ پورٹر آیا اور سامان اُٹھا کرلے گیا۔ اور مَیں نیچے ناشتہ کے لیے اُتر آیا۔ ارباب نیاز ، بیگم ارباب نیاز ، آغا ناصر، حبیب الرحمان ، افضل قادر اور بیگم کوثر افضل قادر ، مادام چنگ ، کامریڈ لِن اور کامریڈ شان سب جمع تھے ۔

ناشتہ کیا اور گیسٹ ہاؤس کے پورچ میں نکلے۔ باہر سماں ہی اور تھا۔ رات بھر کی بے چینی کا سبب معلوم ہُوا۔ دل میں کانٹے سے چبھنے کی وجہ سمجھ میں آئی کہ موسم ایک نئی کروٹ بدل چکا تھا۔ رات بھر سے برف باری جاری ہے۔ زمین سفید فام ہو چکی ہے۔ اور درختوں پر برف کے برگ و بار پھیل چکے ہیں۔ میں کار میں بیٹھنے سے پہلے پورچ سے نکل کر کھُلی فضا میں چند لمحوں کے لیے کھڑا ہو گیا۔

اد یار کیوں بیمار پڑنے کا ارادہ ہے۔ ارباب نیاز نے مجھے کہا۔

صحت یاب ہو رہا ہوں خاں صاحب۔ مَیں نے جواب دیا۔

مسافر کو زادِ سفر سے بے خبر نہیں رہنا چاہیئے۔ ہر منظر کی ایک برکت اور ہر موسم کی ایک دُعا ہوتی ہے۔ ضرور لینی چاہیئے۔

گاڑیاں آہستہ آہستہ ائرپورٹ کی جانب رینگنے لگیں۔ نیف ڈیک کے آغا ناصر نے کہا۔

چلو اچھا ہُوا خیر سگالی کے سٹریو اظہار کی تکرار سے فراغت ہوتی۔ آدھے دن کھانے میں اور آدھے دن شکریے میں گزر گئے۔ بندھے ٹکے پروگرام ختم ہوئے۔ کیا ایک بک بک تھی یار کہ موسم اس لیے بہت سرد ہے کہ ہیں اپنے ساتھ لایا ہوا اوورکوٹ پہن سکوں اور سردی کی شدت کم ہو ذرا تو یوں کہنا پڑے کہ سردی میرے لیے کم ہوگئی ہے کہ مَیں اوورکوٹ اُتار سکوں۔ یہ بادل اُتر کر ہمارے بلائیں لینے آ رہے ہیں اور یہ دھوپ ہمارے گال تھپتھپانے کے لیے نکلی ہے۔ درختوں کے پتے ہمارے استقبال کے لیے جھڑ کر فرشِ راہ ہو گئے ہیں۔

شاعری کرنے لگے ہو آغا۔ مَیں نے آغا ناصر کو بے حد جذباتی ہوتے دیکھ

کر کہا۔ اور وہ ہنس دیا۔

گاڑی بیجنگ شہر سے نکل کر ائرپورٹ کی جانب رواں ہے۔ بیجنگ ساٹھ۶۰ لاکھ آبادی کا شہر جس میں ۳۰ لاکھ سائیکلیں ہیں۔ ایرپورٹ روڈ پر آتے وقت شام کا سماں تھا اور درخت ٹنڈ منڈ تھے۔ اب صبح کا عالم ہے۔ اور درختوں نے برف کی چادر اوڑھ لی ہے۔ گاڑیاں تشویشناک حد تک سست رُو ہیں۔ اندیشہ تھا کہ جہاز نکل جائے گا۔ مگر ہم بروقت ائرپورٹ پہنچ گئے۔ برفباری کے باعث جہاز آدھ گھنٹے کی تاخیر سے ٹیک آف کر گیا۔ بیجنگ میزبان ٹیم میں سے کامریڈ لِن، کامریڈ شان اور مادام چنگ ہمارے ساتھ جا رہے ہیں۔ جہاز کی کھڑکی سے باہر نیچے بادل اور بادلوں کے خلا میں سے پہاڑ دکھائی دیتے ہیں۔ کامریڈ لِن میرے ساتھ کی سیٹ پر ہے۔ ساٹھ سال عمر ہے۔ چھریرا بدن ہے اور شریف آدمی ہے۔ اس کی بڑی لڑکی بیجنگ کے ایک کالج میں لیکچرار ہے۔ یہ خود کلچر ڈپارٹمنٹ میں ڈپٹی ڈائریکٹر ہے۔ ثقافتی انقلاب میں جب کلچر وغیرہ زد میں آئے تو یہ بھی متاثر ہُوا اور ایگریکلچر میں چلا گیا اور کھیتوں میں مشقت کرتا رہا۔ اب دوبارہ بحال ہو چکا ہے اور بہت خوش ہے۔ انگریزی بول لیتا ہے۔ مگر اُردو سے ناواقفیت ظاہر کرتا ہے۔ مگر اُردو سنتا بڑے غور سے ہے۔

مادام چانگ کمیشن برائے ثقافتی تعلقات کی ڈائریکٹر ہیں کٹے ہوئے آدھے سفید اور آدھے کالے بالوں والی معنک خاتون ہر وقت ایک تشویش میں مبتلا دکھائی دیتی ہیں۔ صرف چینی بولتی ہیں۔

فضائی میزبان لڑکیاں چاکلیٹ اور ٹافیاں بانٹ رہی ہیں۔ کامریڈ لِن نے اپنے لیے اور میرے لیے ٹرے میں سے اُٹھا کر اُسے شے شے کہا۔ زیادہ

وقت خاموشی میں گزرا - اور باہر جہاز سے ایک ہی منظر چلا آرہا تھا اور جہاز کے اندر بھی مسافر چپ چاپ اپنے آپ میں مگن تھے - پھر جہاز اُترنے والا ہے - یہ اعلان چینی میں پھر انگریزی میں ہوا - اور جہاز شینگ ہائی کے ہنگ چیاؤ بین الاقوامی ائرپورٹ پر اُتر گیا - شینگ ہائی کی میزبان ٹیم نے ہمارا استقبال کیا اور کاریں شینگ ہائی شہر کو روانہ ہوئیں - ائرپورٹ سے نکلتے ہی ایک طلسم آباد میں داخل ہوئے - سڑک کے دونوں جانب چوڑے پتوں والے ایک عمر اور ایک ہی فاصلہ پر گھنے درختوں کی شاخیں آپس میں گلے مل رہی تھیں - اور یوں اوپر سڑک پر مسلسل سائبان بنتا ہے - درختوں کے سبز پیلے اور براؤن پتوں سے چھن چھن کر آتی روشنی بڑا سُندر سماں پیدا کرتی ہے اور ہَوا سے آپس میں بجتے پتوں کی آواز بڑی مترنم ہے اور ہم تو ازل سے ہی جاں جادہ ہواتے سبر رہگذار ہیں - سڑک کے دونوں جانب سبزہ ہی سبزہ ، کھیت ہی کھیت اور جلد ہی آبادی شروع ہوگئی - شینگ ہائی اپنی شہری طرز میں یورپین شہروں جیسا ہے اور کھیتوں میں دہقانوں کی ماؤ کیپ جیکٹ اور پتلون سے نظر ہٹ جاتے تو پنجاب کے زرعی علاقوں کا منظر ہو بہو ہے - سڑکوں اور گلیوں تک میں درختوں کا سائبان شینگھائی کے حُسن کا ایک اہم عنصر ہے - ایک قدیم شہر جو اپنے چپے چپے سے ایک انفرادیت کا اظہار کرتا ہے - پُرانے شینگ ہائی کی سڑکیں اور گلیاں زیادہ کھُلی نہیں ہیں اور انسانوں کے ہجوم سے اور بھی تنگ داماں لگتی ہیں - سڑک پر کھُلتے دروازے اور کھڑکیاں سڑک پر فرش سے زیادہ سے زیادہ دو فٹ بلند ہیں - یقیناً یہ ایک خاص نقطۂ نظر سے کبھی ایشیا کا پیرس ہو گا - یہ ایک معروف شہر ہے اور بارونق بندرگاہ ہے - اِس شہر کی انقلابی خدمات بھی قابلِ تعریف ہیں - انگریزوں ،

فرانسیسوں نے یہاں کیا کیا گل کھلائے اور جو تھوڑی بہت کسر باقی رہ گئی وہ جاپانیوں نے پوری کر دی اور ہم تازہ واردانِ بساط ہوائے دل کو یہ اندازہ کرنے میں زیادہ دقت نہ ہوئی کہ اسے ایک نائٹ کلب میں بدلنے کے لیے غیر ملکی استعمار نے کتنی عقل صرف کی اور کتنی دولت سے تجوریاں بھریں۔ جبھی اس شہر کا پُرانا حصّہ روشن دنوں سے زیادہ روشن راتوں کا نوحہ خواں لگتا ہے۔

ہماری گاڑیاں بارونق بازاروں سے گزرتی ہوئی جنگ جیانگ ہوٹل کے عالی شان پورچ میں رُک گئیں۔ اِس ہوٹل کے دو حصّے ہیں۔ ایک وکٹورین طرزِ تعمیر کا اور دوسرا فرانسیسی طرزِ تعمیر کا ہے۔ ہم پُرانے یعنی وکٹورین طرز کی بلڈنگ کے چھٹے فلور پر کمرہ نمبر ۶۰۹ اور آغا ناصر کمرہ نمبر ۶۰۸ میں ٹھہرے۔ یہ ہوٹل ایک فرانسیسی یہودی نے بنوایا تھا۔ اُس کی جائیداد نان جنگ سٹریٹ تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہودی ہونے کے ناطے سے پراپرٹی ٹیکس کا چور تھا۔ بالآخر بھاگ نکلا مگر ممکن ہے کہ دبے پاؤں واپس بھی آ گیا ہو کیونکہ ہم نے بازاروں میں چینیوں کو کوکا کولا پیتے دیکھا ہے۔ اس ہوٹل میں وکٹورین عہد کی پُرانی لفٹ بڑے سے ہینڈل والی جس میں مسافروں کی تعداد کی کوئی پابندی نہیں۔ کھٹا کھٹ چلتی ہے۔ یہ ہوٹل بہت پُرآسائش اور اس کا دامن بہت وسیع ہے۔ اِسی ہوٹل میں ہم نے پہلی بار ڈاکخانہ بنک سٹیشنری سٹور فرینڈ شپ سٹور ایک نہیں تین چار دیکھے ہیں۔ اس کا لاؤنج بہت خوبصورت اور ایک خاص قسم کی نشہ آور باس سے مہکتا ہے۔ ہم یہ بُو سُونگھ رہے تھے کہ کراچی سے بیجنگ پرواز کے دوران گئی ۸۵ سالہ امریکی ڈشکرا سامنے صوفے پر اپنی بیٹیوں برابر دو میموں کے درمیان سینڈ وچ بنا بیٹھا بڑا ہشاش بشاش نظر آیا۔ اس کی ان بیٹیوں برابر خواتین کی عمریں زیادہ

سے زیادہ ساٹھ ساٹھ سال ہوں گی۔ مگر امریکی ڈشکرا بڑا اِترا رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی اُچھلا ہیلو ہیلو کرنے کے بعد زندگی مسرت ہے۔ مسرت زندگی ہے کا راگ الاپنے لگا۔ ہم نے جان چھڑائی اور ڈائننگ ہال کو چلے گئے۔ دوپہر کا کھانا کھایا۔ یہاں کھانے میں ہمیں پاکستانی تکے بھی کھانے میں ملے۔ جن کا بہت لُطف آیا۔

۱۳

ساڑھے تین بجے شینگھائی فلم سٹوڈیو دیکھنے گئے۔ شینگھائی میں چار سٹوڈیوز ہیں۔ شینگھائی فلم سٹوڈیو ڈاکومنٹری فلمیں بناتا ہے۔ اور یہ ہماری خاص دلچسپی کا مرکز تھا۔ یہ سٹوڈیو جدید آلات سے بھی آراستہ ہے۔ مگر یہاں بھی جو کیفیت ہمارے سٹوڈیوز میں عنقا ہے۔ وہ یہ کہ پورے ماحول میں اپنے وسائل کی مدد سے جدید دُنیا کی دوڑ میں شانہ بشانہ چلنے کا عزم عیاں ہے۔ سٹوڈیو کے مختلف فلور دیکھے۔ شوٹنگ دیکھی۔ پانچ فلموں کے رش پرنٹ دکھائے گئے۔ جن میں سے اوّل ایک چینی روایتی خطّاط کے بارے میں تھی۔ واہ کیا شان تھی خطّاط جناب کی۔ یوں لگتا تھا کوئی نواب تھا۔ کوئی فرمانروا تھا کہ معاشرے کا ہر فرد دیدہ و دل فرشِ راہ کیے ہوئے ملتا ہے۔ ہر حسین کی چشمِ غزالی میں خواب اُسی خطّاط کے برِاُمیدے آں کہ روزے بشکار خواہی آمد۔ پانچ فلموں کے رش پرنٹ ہمارے لیے بڑے معلومات افزا ثابت ہوتے۔ چین جیسے وسیع علاقے اور کثیر آبادی والے ملک اور گوناگوں مصروفیات والے معاشرے میں گھوم پھر کر کچھ مشاہدہ کرنے کی فُرصت ہمارے مقدر میں نہ تھی۔ اِس کام کے لیے تو

کئی سال چاہئیں۔ چینی چونکہ بہت زیادہ حقیقت پسند لوگ ہیں۔ توقع کی جاسکتی ہے کہ فلموں میں مواد بھی مبنی بر حقیقت ہی ہوگا اور چینی حکومت کی معاشرتی پالیسی کا آئینہ دار بھی۔ پس ان فلموں میں بوس وکنار سے لے کر جدید مغرب کا سارا گلیمر موجود ہے۔ اِس تضاد کے ساتھ کہ معاشرے میں ایسے سارے لذیذ کام اچھے نہیں سمجھتے جاتے ہیں۔

سکرپٹ رائٹرز سے ملاقات ہُوئی اور ڈائریکٹرز سے تبادلۂ خیالات ہوا۔ عصرِ حاضر کے مقبول فلمی ہیرو اور ہیروئن سے گپ شپ اور ایک پُرانی ہیروئن جواب کریکٹر ایکٹنگ کرتی ہے سے بھی شرفِ نیاز حاصل ہوا۔ بڑی متین بڑی دبی دبی سی مُسکراہٹ والی خاتون ایک عجیب سحر کی گرفت میں اُس کی شخصیت تھی۔ وہ دیکھتی تھی توشعور کی سطح پر ملتی تھی اور آنکھیں جھکاتی تھی تو چہرے پر لاشعور کا سرمئی سایہ سا پھیل جاتا تھا ـــــ جب فرانسیسی مسٹنڈے برطانوی لوفر اور جاپانی فراڈیے پُرانے دنوں کی رونق تھے۔ جب راتیں بیدار اور دن غنودگی میں ڈوبلتے تھے۔ شینگ ہائی کا ہر گھر طوائف کا کوٹھا تھا۔

بیجنگ کے برعکس شینگ ہائی کی سڑکوں پر لوگ ہنستے کھیلتے خوش گپیاں کرتے دکھائی دیتے ہیں اور سرِ شام گلیوں بازاروں میں عجیب ہنگامہ سا ہوتا ہے۔ نوجواں جوڑے بانہوں میں بانہیں ڈالے اور اس سے زیادہ جوشیلے جوڑے ایک دوسرے کے گلے میں لٹکتے جھُومتے چلتے پھرتے ہیں۔ مِس تن جو شینگ ہائی کی میزبان ٹیم کی ایک اہم رُکن تھی۔ لمبی اُونچی کٹے ہُوتے بالوں والی متبسم لڑکی سے آغا ناصر نے پُوچھا کہ شادی کا طریقہ یہاں کیا ہے۔ پہلے تو وہ شرمائی پھر اپنے فرائض کا احساس کرکے بولی کہ چین میں ایک لڑکا جب کسی لڑکی کو پسند کرتا ہے، تو وہ اس لڑکی کی قریب ترین سہیلی سے رابطہ کرکے اپنا مدعا بیان کرتا ہے۔

وہ لڑکی لڑکے کے چند دوست اور اپنی سہیلی اور ایک دو اور سہیلیوں کے ساتھ ایک پارٹی کا انتظام کرتی ہے۔ وہاں یہ مدّعا بیان کیا جاتا ہے کہ محترمہ آپ کو یہ صاحب اپنی بیوی بنانا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد ان دونوں کو کچھ وقت کی تنہائی دی جاتی ہے۔ وہ کچھ بنیادی مسائل پر اگر اتفاق کر لیں تو اُن کی شادی کا عبوری دَور شروع ہو جاتا ہے اور یہ عبوری دَور دو تین سال تک بھی رہ سکتا ہے۔ اس مدّت میں وہ اگر جنسی تجربہ سے بھی گزرنا چاہیں تو گزر سکتے ہیں۔ مگر اولاد پیدا نہیں کر سکتے جس کے لیے سزا ہے۔ آزمائشی عبوری دَور میں وہ اگر یہ محسوس کریں کہ اُن میں ضروری مفاہمت پختہ ہو چکی ہے۔ تو وہ رجسٹرار کے پاس حاضر ہو کر اپنا کیس رجسٹر کرواتے ہیں اور میاں بیوی بن جاتے ہیں۔ ان کو ایک عدد شناختی کارڈ مل جاتا ہے کہ یہ مسٹر فلاں ہیں۔ اور یہ مسز فلاں ہیں۔ یہ جو آپ کو تاریک گوشوں میں محبت کرتے جوڑے دکھائی دیتے ہیں یا سرِعام گلے لگے نظر آتے ہیں۔ یہ سب آزمائشی دَور کے مسافر ہیں۔

عالمِ جوشِ جنوں میں ہے روا کیا کیا کچھ۔ یعنی اس جنسی اختلاط کو سوشل ایول ہونے سے روکنے کا کیا بندوبست ہے ؟

مَیں نے پُوچھا تو مِس لِن نے جواب دیا۔

نہیں جناب کُھلی چُھٹی نہیں ہے۔ پولیس اور خفیہ پولیس مشکوک جوڑوں سے پوچھ گچھ کرتی ہے۔ میاں بیوی ہونے کی صورت میں انھیں شادی کارڈ دکھانے پڑتے ہیں۔

اور اگر آزمائشی دَور سے گُزر رہے ہوں تو پھر کیا دکھاتے ہیں اربابِ نیاز نے پُوچھا اور مس لِن نے جواب دیا۔

پھر کچھ نہیں دکھاتے بس کہہ دیتے ہیں کہ ہم آزمائشی دَور سے گزر رہے ہیں۔

حبیب الرحمٰن جو واقفِ حال تھا فوراً بول پڑا

بادشاہو۔ پکڑے جانے کا خطرہ صرف شادی شدہ لوگوں کو ہوتا ہے کہ اگر راہ چلتے اردگرد کے ماحول سے متاثر ہو کر خود بھی عبادتِ آب دہوا کرنے لگیں اور پولیس والا پوچھ لے اور بدقسمتی سے وہ دونوں یا اُن میں ایک کا بھی کارڈ پاس نہ ہو تو سیدھے تھانے میں۔ جبکہ آزمائشی دور والے صرف یہ کہہ کر چھٹکارا پالیتے ہیں کہ آزمائشی دَور سے گزر رہے ہیں۔ بس

رات کو شینگ ہائی کے میئر نے اسی ہوٹل میں عشائیہ دیا۔

穆罕默德·阿斯拉姆·卡玛尔

۱۷ نومبر کی صبح اُٹھ کر کھڑکی کر شینگ ہائی شہر پر نظر ڈالی۔ تو باہر بارش ہو رہی تھی تیار ہو کر تیسرے فلور پر ڈائننگ ہال میں ناشتہ کی ٹیبل پر سب جمع ہوئے۔

یار یہ کِنگ حسین تو نہیں ؟ آغا ناصر نے ساتھ والی ٹیبل کی طرف اشارہ کر کے پُوچھا۔

"کون ہے کنگ حسین ؟"۔۔۔ بیگم ارباب نیاز نے پُوچھا۔

"یہ ساتھ والی ٹیبل پر !"۔۔۔ بیگم افضل قادر نے بتایا۔

" وہ ادھر کیسے ہو سکتا ہے ؟"۔۔۔ افضل قادر نے بات ختم کرنی چاہی۔

ہاں دیکھو یار اس کا قد کاٹھ رنگت بال اور داڑھی سب ویسی ہے ۔ ارباب نیاز نے دادِ شباہت دی۔ پھر دوسری ایک ٹیبل کی طرف اشارہ کر کے بولے۔

یار یہ امریکی بوڑھا نوجوان ہر جگہ محفل جما لیتا ہے۔ کہتا ہے۔ میرے پاس بے شمار دولت ہے۔ کوئی ذمّہ داری باقی نہیں رہی ہے۔ اب ساری عمر عیش و عشرت میں کاٹوں گا۔

ہاں اس کا گپ مارنے کا ۸۵ سالہ تجربہ ہے۔

حبیب الرحمٰن بولا۔

۸ بجے شینگ ہائی کا ایک کمیون دیکھنے روانہ ہوتے۔ ایک گھنٹہ کی ڈرائیو کے بعد کمیون پہنچ گئے۔ کمیون کے تنظیمی ڈھانچہ میں اوّل ٹیم ہوتی ہے۔ دوم بریگیڈ اور سوم کمیون۔ اس کمیون کے صدر سے کمیون ہال میں ملاقات ہوئی۔ چٹا اَن پڑھ سادا سا کسان تھا۔ مگر گفتگو بڑے اعتماد سے کرتا تھا۔ لڑائی جھگڑا چوری چکاری زنا اور دوسرے معاشرتی جرائم کی روک تھام کے طریقِ کار پر باتیں ہوئیں زمین کی پیداوار اور اوسط پیداوار بڑھانے کی تدابیر زیرِ بحث آئیں۔ اس کمیون کا ایک ہینڈی کرافٹ سنٹر دیکھا۔ ایک مویشی خانہ اور ریڈی میڈ ملبوسات کی ایک فیکٹری دیکھی۔ پھر ایک سکول کی سیر کی اور مڈل کے بچوں کو دیواریں پھاندتے کھڑکیوں سے کودتے دیکھ کر اپنا مڈل کلاسز کا زمانہ سارے ارکانِ وفد کو یاد آیا۔ کمیون سے واپسی پر شینگ ہائی سپورٹس کامپلکس دیکھا۔ جس میں والی بال اور ٹیبل ٹینس کی پریکٹس دیکھی۔ سپورٹس کامپلکس کے فرش دیواروں اور چھتوں کی چمک دمک دیکھ کر پوچھا اس کا افتتاح باقاعدہ کب ہونے والا ہے۔ جواب ملا۔

پندرہ سال ہو چکے ہیں۔ باقاعدہ افتتاح ہوتے۔

ہماری حیرت ابھی ختم بھی نہ ہو پائی کہ یہ سُنا کہ پندرہ ہزار تماشائیوں کے لیے اِس سٹیڈیم کی چھت علیحٰدہ تیار کر کے اس پر لگائی گئی تھی۔ پس ہم بدحواس ہونے کے سِوا اور کیا ہو سکتے تھے۔ واپس جنگ جیانگ ہوٹل۔ دوپہر کا کھانا کھایا اور تکے والی ڈِش کا انتظار کیا۔ مگر روز روز تکے کباب کہاں۔ ہم چین میں تھے لاہور کے صفانوالہ چوک میں تو نہ تھے۔ دو پہر کے کھانے کے بعد

ابھی کمروں میں پہنچے اور ہاتھ مُنہ، ہی صاف کیا کہ پتہ چلا حبیبُ الرّحمٰن کی زبانی کہ چند منٹ بعد ہماری سواری شینگ ہائی کے صنعتی نمائش گھر کو روانہ ہونے والی ہے۔

صنعتی نمائش گھر شینگ ہائی ایک پُرشکوہ عمارت ہے طرزِ تعمیر پیگوڈا اور چرچ کی خوب صُورت آمیزش کا نمونہ ہے۔اس کے اندر مصنوعات کی طرزِ نمائش دیکھنے کی چیز تھی۔ بھاری مشینوں سے لے کر ملبوسات اور کاسمیٹکس کی اشیاء جس قرینے اور سلیقے سے سجائی گئی تھیں۔اُن کا حُسن دوبالا ہو گیا تھا۔ یہ عمارت دومنزلہ ہے۔اور کئی ہالوں پر مشتمل ہے صنعتی نمائش کی سیر کے بعد شینگ ہائی چلڈرن پیلس پہنچے۔ ننھے مُنّے بچّوں نے پھُولوں کے گُلدستوں سے استقبال کیا۔ اس پیلس کی سیر ایک عجیب وغریب تجربہ تھا۔ جو دل میں اُمنگ اور رُوح میں نور ہی نور بھر گیا۔ چین کا ثقافتی مستقبل کتنا واضح اور متعین ہے۔رقص، نغمہ، مصوری، خطاطی اور کشیدہ کاری کی تربیت سے لے کر کھیلوں کی کوچنگ کا شاندار انتظام دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ پانچ پانچ چھ چھ سال کے بچے بچیاں اس کمرہ میں آرٹ سیکھ رہے ہیں۔ دوسرے میں خطاطی سکھائی جارہی ہے۔ ادھر موسیقی کی تدریس ہو رہی ہے۔ ادھر نغمہ بلند ہو رہا ہے۔ وہاں رقص کی تعلیم دی جاری ہے۔ یہاں کشیدہ کاری کی تربیت ہو رہی ہے۔ مَیں نے ننھے مُنّے بچّوں کو ایک تصویر بنا کر دی اور بچّوں کے اُستاد نے مجھے ایک خطاطی کر کے بچّوں کی طرف سے پیش کی۔ ٹیبل ٹینس کھیلتے بچّوں کے ہال میں گئے تو ایک ننھی سی گُڑیا نے دوڑ کر ریکٹ میرے ہاتھ میں تھما دی۔ اور میں نے چند منٹ اُس کے ساتھ کھیل کر اُس کا مُنہ چوما اور دل و دماغ میں روشنی ہی روشنی بھر کر جب ہم لوٹ رہے تھے۔ تو بچّوں نے تالیاں بجا کر رقص

کرکے نغمہ گا کر ہمیں الوداع کیا۔ چلڈرن پیلیس شینگ ہائی کے بچوں کے چہروں کا نور کتنے ہی سایوں کے نرغے میں ہمیں لے آیا۔ اپنے وطن کے بچّے بہت یاد آئے۔

رات کو شینگ ہائی کے قدیم تھیٹر میں بیلے" بارش" دیکھا۔ چینی اسٹیج اور پرفارمنگ آرٹس میں چینیوں کی مہارت کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ وہ ایک چھوٹی سی جگہ کو جس سُرعت سے ایک جہان میں بدل لیتے ہیں۔ ہمارے لیے ہی نہیں چینی اور بھی بہت ساروں سے ہزاروں میل آگے ہیں۔ جنگ جیانگ ہوٹل واپس —— پھر سو گئے۔

۱۵

۱۸ر نومبر کی صبح ناشتے میں اناس، کینو، کیلے، توس، مکھن انڈا جام اور کیک پیس بھی ملے۔

۹ بجے کے قریب ہم سب شنگھائی کا ایک باغِ جنت (نوڈریگن والا) دیکھنے گئے۔ یہ جنگ جیانگ سے قریب اور پُرانے شنگھائی کے قلب میں واقع ہے۔ کسی فیوڈل کا بنوایا ہوا یہ باغ دیکھنے کی چیز ہے۔ دُنیا بھر کے پودے اور درخت اس کی زینت ہیں۔ بے شمار پیولین، تالاب، قطعات اور غاریں اِس باغ کی رونق ہیں۔ ایک جادو کی نگری ہے۔ جس میں گرے چٹانیں بادلوں کی طرح تیرتی دکھائی دیتی ہیں اور غاریں الف لیلوی منزلیں لگتی ہیں۔ تالاب، پُل اور انسانی مجسمے انسان اور فطرت کے مثبت رشتوں کو مستحکم کرتے اور سے اور منظر نت نئی بلندیوں پر بنانے کی خواہش بیدار کرتے ہیں۔ چینی روایتی مصوری اور خطاطی کے شہکار دعوتِ نظر دے کر دامنِ دل کو بھرتے اور رُوح میں شعلۂ نور جگا کر تخیل کو پرِ پرواز دے دیتے ہیں۔

اس باغِ جنت کے گرد جو فصیل ہے وہ نو (ڈریگن) اژدہوں کا تسلسل ہے۔ جب اہلِ شنگھائی کی عوامی جدّوجہد آزادی نقطۂ عروج کو پہنچی

تو اس باغ کے نو اژدھے بڑھتے قدموں کی یلغار روک نہ سکے اور اس باغ کا ایک پیویلین جس میں اس وقت کھڑا ہوں حریت پسندوں کا ہیڈکوارٹر بنا۔ میں مشرق کی جانب دیکھتا ہوں۔ اونچی اونچی عمارات کو عبور کر کے درختوں کی گھنی شاخوں میں سے گزر کر سورج کی کرنیں اس پیویلین کی چوکھٹ عبور کر چکی ہیں۔ اس پیویلین میں حریت پسندوں کے ہیرو اور ہیروئن کی تصاویر ہیں۔ میں انھیں سلام کرتا ہوں۔

دس بجے مادام چانگ اور ایک انگریزی مترجم کے ساتھ چائنا انسٹیٹیوٹ آف آرٹس شینگ ہائی پہنچا۔ روایتی چینی طرزِ تعمیر کا ایک اعلیٰ نمونہ یہ خوبصورت عمارت واقعی فنون کا گہوارہ لگتی ہے۔ پھولوں بھری کیاریاں، درختوں کی فنکارانہ تراش خراش سبز و شاداب قطعات اور پھول دار بیلوں بھری دیواریں چینی ذوقِ جمال کی بھرپور ترجمانی کرتی ہیں۔ چینی مصوری اور خطاطی کا بیش قیمت سرمایہ یہاں دعوتِ نظر دیتا ہے۔ چینی معاشرے میں مصور اور خطاط کا مرتبہ یکساں قابلِ احترام ہے۔ چینی زبان میں مصور کو خواجہ اور خطاط کو سوفاچہ کہتے ہیں۔ چینی مصور مرد وزن سے جب مرا تعارف مادام چنگ نے یہ کہہ کر کروایا کہ کامریڈ اسلم کمال خواجہ اور سوفاچہ بھی ہے تو حاضرین میں ایک حیرت کی لہر دوڑ گئی۔ سب نے بڑے تپاک سے استقبال کیا۔ چینی زبان تقریباً ایک لاکھ کریکٹرز پر مشتمل ہے۔ چینی خطاطی بائیں سے دائیں اور اوپر سے نیچے کی جانب ایک سی روانی سے لکھی جاتی ہے۔ قلم کی بجائے ایک خاص قسم کا موقلم جو چینی مصوری میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ روشنائی خاص طور پر تیار کی جاتی ہے۔ اور خشک کر کے چھوٹے چھوٹے قرص بنا لیے جاتے ہیں۔ حسبِ ضرورت حل کر لی جاتی ہے۔ موقلم کا منہ یعنی بالوں والا حصہ اچھی خاصی روشنائی کی مقدار

اپنی چونچ میں بھر لیتا ہے۔ لکھتے وقت سارا کنٹرول فنکار کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ وہ حسبِ ضرورت ہاتھ کو دباتا اور ڈھیلا کرتا ہے۔ لکھائی کے اُتار چڑھاؤ اور پھیلاؤ کے لیے ہاتھ میں وزن بڑھاتا اور کم کرتا ہے۔ چینیوں کا موقلم پکڑنے کا انداز بھی منفرد ہے۔ چینی فن کار موقلم کو انگوٹھے کے دباؤ میں تین انگلیوں پر جماتے ہیں اور چھوٹی اُنگلی انگوٹھے کے دباؤ کو متوازن کرتی ہے۔ اس طرح موقلم کی نوک کا رُخ معکوس ہو جاتا ہے۔ دورانِ عمل ہمارا ہاتھ تو ساکت رہتا اور انگوٹھا اور انگلیاں آگے پیچھے حرکت کرتے ہیں۔ مگر چینی فنکاروں کا ہاتھ اور انگلیاں برابر جمی رہتی ہیں مگر بازو متحرک رہتا ہے۔

اِس گہوارۂ فن میں مصوّر عورتیں، لڑکیاں اور مرد کافی تعداد میں آئے تھے۔ اُن سے تبادلۂ خیالات ہوا۔ پھر ایک چینی مصوّر نے مظاہرۂ فن کیا اور راقم نے کسبِ کمال دکھایا۔ چینی خطاطوں نے خطاطی کی تو میں نے خطِ کمال کے جلوے ارزاں کیے۔ اُن کے لیے یہ حقیقت بڑی تعجب خیز تھی کہ ایک ہی شخص خطاطی اور مصوّری کرتا ہے۔

ایک چینی مصوّر دوشیزہ جہاں روایتی چینی مصوّری میں بھی بڑی تاک تھی وہاں اپنے حسن و جمال میں بھی منفرد تھی۔ اس کی شخصیت میں وہ سارے فتنے جمع تھے کہ پہلی ہی نظر میں اہلِ دل پکار اٹھیں۔ "نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش دلِ ریزہ ریزہ گنوا دیا۔" لمبی لمبی سیاہ آنکھیں رونے والوں کی طرح جاگنے والوں جیسی سخت وحشت پیشہ تھیں۔ تیکھی ناک پتلے پتلے ہونٹ لمبی گردن سُرخ و سفید رنگت اور قد و قامت میں ایسی کہ کوئی معتقدِ فتنۂ محشر بھلا کیسے نہ ہو کہ جیکٹ پتلون اور ماؤ کیپ میں تو وہ فی الواقع افسرِ شمشاد قداں لگتی تھی۔

ایک چینی خطاط نے مجھے اپنی ایک قومی نظم کے کچھ اشعار کی خطاطی

کرکے پیش کی ۔ مَیں نے شکریے کے ساتھ قبول کی اور جواب میں خطاطی کی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اور انگریزی مترجم کو بتایا کہ اس کا معنی ہے۔ In the Name of Allah, The Beneficient, The Merciful

تو اُس نے چینی ترجمہ اُن کو سُنایا تو تمام کامریڈ حیرت سے مُنہ کھول کر کبھی مترجم کو کبھی مجھے اور کبھی ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

مَیں نے بُرش پکڑا اور سیاہی میں ڈبو کر ایک لمبے چوڑے کاغذ پر لکھا۔

الذی علم بالقلم

اور مترجم کو بتایا

Who Teaches by the Pen

مترجم نے اُن کو چینی ترجمہ سُنایا تو وہ اور بھی حیران ہو گئے۔ اور کافی دیر تک مترجم کے ساتھ چینی میں کھُسر پھُسر کرتے رہے۔ جب فارغ ہوئے افہام و تفہیم سے تو مترجم نے بتایا کہ آپ کے طرزِ تحریر سے تو بہت متاثر ہیں۔ اور خوب داد دے رہے ہیں۔ مگر جو کچھ آپ لکھ رہے ہیں۔ یہ سمجھ نہیں پا رہے کہ وہ کون ہے۔ مہربان اور رحم کرنے والا اور جس نے قلم سے لکھنا سکھایا ہے۔

مَیں نے بُرش سے پھر رنگ لگایا اور لکھا۔

قل ھو اللہ احد

Say: He is Allah, The One

مترجم نے چینی ترجمہ سُنایا تو سب نے میری طرف دیکھ کر ایک ایک اُنگلی کھڑی کی۔ جیسے وہ مجھے یقین دلا رہے تھے۔ کہ میرا لکھا اُن کی سمجھ

یں آگیا تھا۔ مگر مجھے یقین تھا کہ ان کی سمجھ میں آنے والا صرف ہندسہ ایک ہے۔ پھر بھی مَیں نے اس کو اقرار باللسان کے طور پر غنیمت جان کر آخری خطاطی کی

إنّا لله وَ إنّا اليہ راجعون

We are Allah's and unto him we are returning

پھر ایک مصوّر نے روایتی چینی مصوّری میں ایک تصویر بنائی۔ چینی روایتی مصوّر گہرے سے ہلکے رنگ کی سمت بڑھتے ہیں اور تصوّر مختلف مدارج طے کرتی ہوئی دُھند سے نکلتی محسوس ہوتی ہے۔ جیسے فوٹو پرنٹ آہستہ آہستہ ڈیولپر سے نکھرتا ہے۔ یہ بوقلمونی چینی سرزمین اور فطرت کے درمیان ایک خوشگوار مفاہمت اور مصالحت کی نشاندہی کرتی ہے۔ جہاں کے پہاڑ، دریا، جنگل رتوں اور موسموں کے ساتھ دلچسپ آنکھ مچولی کھیلتے ہیں۔

چینی مصوّر اور خطّاط اپنی ضروریات کی تمام اشیاء اور سامان اپنی یونین سے حاصل کرتے ہیں۔ اور فن پارہ مکمل کرکے خود اس پر سرکاری مہر ثبت کرکے یونین میں جمع کرواتے ہیں اور تصویروں سرکاری ملکیت بن جاتی ہے۔ چنانچہ چینی مصوّر نے تصویر مکمل کی۔ مہر لگاتی یونین کے رجسٹر میں اندراج کیا اور لکھا کہ کامریڈ فلاں کو جو فلاں ملک کا ہے۔ تحفے میں دی گئی اور مَیں نے شے شے کہہ کر قبول کرلی۔

جواب میں ایک اور تصویر مَیں نے بنائی اور اُسی مصوّر کو پیش کردی۔ باقی خطاطیاں خطّاط حضرات کو پیش کردیں اور شے شے ——— شے شے کی آوازیں گوشِ سماعت میں سنبھال لیں۔

پھر آٹو گراف کا سلسلہ چلا۔ جو کافی دیر چلتا رہا۔ اور افسر شمشاد قداں نے

اپنی آٹو گراف بُک آگے بڑھائی۔ جس پر مَیں نے "تو اور آرائشِ خمِ کاکل" کا سماں باندھا۔ اُس نے اگلا ورق اُلٹ دیا۔ اُس پر مَیں نے کوچۂ دلبراں کے درو دیوار بنا کر روزن اور دریچوں میں پری چہروں کے چاند روشن کیے اور اس ہجوم میں اپنی شبیہِ آشفتہ خاطر کہ ؎

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

تو اس نے پھر ورق اُلٹ دیا۔ پھر ہم اس کے سادہ اوراق باتصویر کرتے گئے ــــ حدیثِ دل کی تفسیریں، پندار کے صنم کدہ کی تصویریں ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں، آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز غرض سو ڈھنگ سے ہم شرحِ فراق مدحِ لبِ مشکبو کریں کہ اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے ــــ کاش پوچھو کہ مدّعا کیا ہے؟ لیکن ــــ کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے۔ اللہ عالم الغیب ہے۔ مترجم اُس سے کیا کہتا تھا اور ہم سے کیا بیان کرتا تھا ؎

اوروں سے کہا تم نے اوروں سے سُنا تم نے
کچھ ہم سے کہا ہوتا کچھ ہم سے سُنا ہوتا

چار و ناچار سب سے ہنس کر ملے۔ مُسکرا کر کلام کیا۔ گاڑی میں بیٹھے شے شے کہا اور سناہا تھ ہلائے اور میرے دل مرے مسافر گنگناتے نانچنگ سٹریٹ پہنچے کچھ کاغذ خریدے اور کچھ رنگ کہ نسیاں نہ طرزِ مااست وِلے بہر احتیاط کچھ استعارے ہی قرطاسِ دل پر سجا لے چلیں۔

واپس جنگ جیانگ ہوٹل آئے۔ لنچ کیا اور دو دن کے لیے ضروری سامان ساتھ رکھا باقی ہوٹل میں چھوڑا اور ۳ بجے بذریعہ ریل شنگھائی

کے خوب صورت ریلوے سٹیشن سے ہانگچو کے لیے روانہ ہوتے شنگھائی سے ہانگچو تک ریل کا ۲۱/۲ گھنٹے کا سفر ہے۔ ریل کی فرسٹ کلاس میں خوب صورت آرام دہ نشستیں اور چار نشستوں کے درمیان ایک خوشنما میز جس پر گلدان میں پیارے پیارے پھول شاید اِس لیے تھے کہ ضروری نہیں کہ آس پاس کے مسافر خوب صُورت بھی ہوں۔ گاڑی کافی دیر چلتی رہی مگر شنگھائی کا شہر ختم نہ ہوتا تھا۔ پٹڑی کے بالکل قریب بھی جہاں چند فٹ جگہ ملی ہے۔ چینیوں نے وہاں سبزیاں اُگا رکھی ہیں۔ ان ننھّی مُنّی کھیتیوں میں فصل کی صحت اور بود و باش پر جو توجّہ دی گئی ہے۔ صاف دکھائی دیتی ہے اور گواہی دیتی ہے کہ چینی اپنا بویا ہُوا ہی کاٹنا پسند کرتے ہیں۔ شنگھائی بے انتہا پھیلا ہُوا کثیر آبادی کا شہر ہے۔ شہر میں سے گزرنے والے ندی نالوں میں کشتیاں اور سٹیمر چلتے ہیں۔ جو باہر سے غلّہ اور دوسری ضروریاتِ زندگی کا بھاری سامان شہر میں لاتے ہیں۔ اس طرح شہر کی سڑکوں پر ٹریفک کا بوجھ کم کیا جاتا ہے۔ پھر شنگھائی شہر کی آبادی ختم ہوگئی اور دونوں جانب سبزہ ہی سبزہ دکھائی دیتا ہے۔ فصلیں اپنی بہار دکھا رہی ہیں۔ غلّہ اٹھایا جا رہا ہے۔ سبزیاں لادی جا رہی ہیں۔ بانس اور نرسل کے جھُنڈ ہیں۔ دہقان کھیتوں کے کنارے کنارے ماؤکیپ جیکٹ پہنے میں آلاتِ کشاورزی کاندھوں پر رکھے قطار اندر قطار یوں مستعد دکھائی دیتے ہیں۔ جیسے ہمارے سرحدی دیہات میں فوجی جوان جنگی مشقیں کرتے نظر آتے ہیں۔ کھیتوں میں بڑے بڑے نل ہیں اور لمبی لمبی موٹی ٹیوب سے فصلوں پر پانی سپرے کیا جا رہا ہے۔

آغا ناصر میرے سامنے کی سیٹ پر ہے۔ کامریڈ لن میرے برابر اور حبیب الرحمٰن

اس کے مقابل بیٹھے ہیں۔ گرم گرم چائے ویٹرس نے میز پر رکھی تو مادام چنگ نے بیگ میں سے نہایت نفیس بسکٹ نکالے۔ ہم نے چائے کی چسکیاں لیں اور بسکٹ کھائے۔

مَیں تو صرف چینی جسمین پیوں گا۔ اور مولانا ابوالکلام کی طرح لذّت لینے کی کوشش بھی کروں گا۔

آغا ناصر نے کہا۔

مَیں بھی جسمین چائے کا قائل ہوں اور مولانا کا فرمایا بھی مستند مگر لذّت تو اس میں سے کوشش کرنے سے ہی حاصل ہوتی ہے۔

مَیں نے کہا۔

ہاں کسی کی تعریف کسی اور کے حصّے میں ڈالنا بڑی محنت کا کام ہے۔

آغا ناصر بڑا مدبر بنتا جا رہا تھا اور حبیب الرحمٰن تدبر نہ کرنے والوں میں سے تھا۔ تفکر سے الرجک تھا بڑی ہمدردی سے آغا ناصر کو مشورہ دیا۔

بسکٹ کھاؤ بسکٹ۔ مادام چنگ کے پاس یہی ایک لذیذ شئے ہے۔

مادام چنگ کا نام سُن کر کامریڈ بن نے کان کھڑے کیے۔ تو حبیب الرحمن نے اُس کی طرف بسکٹ کی پلیٹ بڑھائی اور پچکار کر دعوت دی۔

بسکٹ کھائیے۔ بسکٹ۔

یک دم ریل نے ایک خوفناک دھچکا کھایا اور پھر ہموار چلنے لگی۔ سب کے بدن میں تشویش کی لہر دوڑ گئی اور لہر کا اثر زائل کرنے کے لیے۔ مَیں نے کہا۔

یار یہ ریل بہت صاف ستھری ہے۔

ہاں صفائی میں تو اہلِ چین کا جواب نہیں۔

آغا ناصر نے کہا اور پھر سُنانے لگا کہ اشفاق احمد پندرہ سال قبل، چین کے دورے پر آتے تھے۔ انھوں نے یہاں کا ایک واقعہ بہت لوگوں کو سنایا کہ انھوں نے اپنے دورے میں ایک گاؤں والوں کو چھریاں، کلہاڑیاں بھالے اور نیزے لیے ایک طرف کو بھاگتے دیکھا تو سبب پوچھا۔ مگر کوئی بھی جواب دینے کے لیے نہ رُکا۔ تھوڑی دیر بعد وہ سب لوگ چہروں پر فتح و نصرت کی چمک لیے واپس آ رہے تھے۔ اشفاق صاحب فرماتے ہیں۔ مَیں نے پُوچھا۔ بھائی یہ آلاتِ حرب و ضرب لے کر کس جنگ پر دیوانہ وار گئے تھے۔ تو سب نے سینہ پھیلا کر بڑھکیں مار کر کہا۔ ہم نے اپنے دشمن کا قلع قمع کر دیا ہے۔ مَیں نے پوچھا۔ کونسا دشمن۔ کہنے لگے ایک مکھی نظر آ گئی تھی۔ ٹھکانے لگا کر آتے ہیں۔

اشفاق صاحب کا واقعہ بھی سچا ہو گا۔ مگر مَیں نے جنگ جیانگ میں مکھیاں دیکھی ہیں۔ مَیں نے حیرت سے کہا۔

ارے وہ امریکی ڈشکرے کے ساتھ جو چمٹی بیٹھی تھیں۔

حبیب الرحمٰن بولا۔

نہیں بابا حقیقی مکھیاں۔ مَیں مذاق نہیں کر رہا۔

مَیں نے کہا۔

نہیں یار تلقین شاہ کے بقول اہلِ چین نے مکھی کی نسل ہی ختم کر دی ہے۔

آغا ناصر مکھیوں کے خاتمے پر یقین دلانے لگا۔

چلو یار مَیں بھی مان لیتا ہوں۔ اپنے شاہ جی ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ مَیں نے بات ختم کر کے باہر کے منظر میں لطف لینا شروع کیا۔ ندیاں، نالے اور چھوٹے چھوٹے دریا۔ دریاؤں میں اسٹیمرز لدے ہوئے غلّے سے۔ چین کی

سرزمین ۔ حسین سرزمین ـــ میری ناک پر کھجلی سی ہُوئی ۔ مَیں نے ہاتھ اٹھایا تو مکھّی اُڑ کر آغا ناصر کے کاندھے پر بیٹھ گئی ۔

یہ کیا شے ہے ؟ اب کہو ـــ مَیں نے آغا ناصر سے راز داری میں کہا۔ اور آنکھوں سے اشارہ بھی کیا کہ یہ رازداری برقرار رہنی چاہیئے۔ کامریڈ لِن اور مادام چانگ اونگھ رہے ہیں ۔

مکھّی آغا کے کاندھے پر سے اُتری اور حبیب الرحمٰن کی خطرناک مونچھ پر بیٹھ گئی ۔ اُس نے بھی اپنی گول گول آنکھیں گھما کر اقرار کیا۔

ہے ۔ بھئی ہے ۔

مگر یہ راز راز ہی رہے ۔ چینیوں کو پتہ چل گیا۔ تو ہنگامہ ہو جائے گا۔ اودھم مچ جائے گا ۔ قیامت ٹوٹ پڑے گی اور ماں بچے سے بیگا نہ ہو جائے گی ۔ تمام چینی اِس مکھّی پر ٹوٹ پڑیں گے ۔ اور اگر مکھّی ریل کی کھڑکی سے باہر نکل گئی تو یہ بھی چلتی ٹرین سے چھلانگیں لگا دیں گے ۔

مَیں نے بھی اِس بات سے اتفاق کیا کہ فی الحال راز راز ہی رہنا چاہیئے شاہ جی کا کیا ہے ۔ ہم انھیں سمجھا لیں گے ۔ دو زانوں اُن کے سامنے بیٹھ کر عرض کریں گے کہ جس مکھّی کو مار کر آتے لوگوں کو آپ نے دیکھا تھا ۔ اُس مکھّی کی عمر بڑی لمبی ہے ۔ پندرہ سال بعد بھی اب تک شینگ ہائی سے ہانگچو جاتی ریل کے فسٹ کلاس میں سفر کرتی ہے ۔ شاہ جی یہ بات جھٹلائیں گے نہیں ۔ صرف اپنی ناک میں اُنگلی پھیر کر کان کھجلا کر کہیں گے ۔

بابا جی سچ کہتے ہیں ۔ جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے ۔

شام ہو رہی ہے اور سُورج دُور درختوں کی قطار کے پیچھے اُتر رہا ہے یکدم پھر ٹرین نے پہلے سے زیادہ دلدوز جھٹکا کھایا اور خوفناک آوازیں

پٹڑی کے ساتھ پہیّوں کی رگڑ سے پیدا ہوئیں۔ سب لوگ گھبرا گئے مگر یہ فائدہ ہوا کہ مادام جنگ کی آنکھ کھل گئی۔ بیچاری اُٹھی اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد لوٹی اور کہنے لگی۔

ٹرین کی بریک میں گڑبڑ ہے۔

پھر گاڑی ہانگچو کے بہت بڑے ریلوے اسٹیشن پر رُک گئی۔ وی آئی پی لاؤنج میں پہنچے اور ہانگچو کی میزبان ٹیم نے خوش آمدید کہا۔ گاڑیاں اسٹیشن سے نکلیں تو ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ اور سڑک کے دونوں جانب دہی شنگ ہائی والے درخت گہرا سایہ کیے ہوئے۔ بہت اندھیرا تھا۔ پھسلن تھی۔ گاڑیاں بائیں جانب مُڑ گئیں اور بائیں ہاتھ پر ایک وسیع و عریض جھیل کے کنارے پر رینگنے لگیں۔ سڑک پر خوب صورت روشنیاں جگہ جگہ تھیں اور جھیل میں روشنیوں کا عکس بڑا نظر افروز تھا۔ اگرچہ رات کا سماں تھا اور اندھیرا بھی گہرا مگر حواسِ خمسہ نے فرحت محسوس کی۔ تھوڑی دیر بعد جھیل کنارے ایک عالی شان ہوٹل کے پورچ میں گاڑیاں رُک گئیں۔ یہ ہانگچو ہوٹل ہے۔ ایک خوب صورت پُر آسائش نہایت لمبا چوڑا ہوٹل ہے۔ چوتھے فلور پر ۴۱۳ نمبر دو دن کا مسکن ٹھہرا۔ رات کا کھانا کھایا اور جھیل کنارے سیر کو نکلے۔ بہت ہلکی بارش کی پھوار ـــــ اندھیرا روشنی جھیل اور جھیل میں روشنیوں کا عکس۔ جھیل کنارے درخت گنجان اور صاف ستھری سڑکیں دونوں طرف سے پھولوں سے آراستہ غرض بڑا ہی رومان پرور سماں تھا، اس وقت اندھیرے کے باوجود یہ صاف پتہ چلتا ہے کہ جھیل میں کنول کے پھولوں کی بہتات ہے۔ روشنیوں کی بریکٹس کا پیٹرن بھی کنول کے پھول کا ہے۔ جھیل کو سڑکوں سے کاٹ کر مختلف حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور خوب صورت پُل بنائے گئے ہیں۔ ہم

ایک سڑک پر جھیل کے بیچوں بیچ آگے نکل گئے۔ درختوں سے سائیکلیں ٹیک کر نوجوان جوڑے گھاس پر بیٹھے راز و نیاز میں محو ہیں۔ کچھ کی سائیکلیں گھاس پر لیٹی ہیں اور وہ درختوں سے ٹیک لگا کر محبت کے بیج بو رہے ہیں۔ کچھ بنچوں پر ایک دوسرے سے سر جوڑ کر خاندانی منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔ اور ہمارے ساتھ اُردو مترجم کامریڈ شان تھا۔ جس کی اُردو دانی کے سب قائل ہو چکے تھے۔ اس رومان پرور ماحول میں ہمیں اکھڑا اکھڑا سا محسوس کر کے بولا۔

صاحب یہ جگہ بہت حسین ہے۔ بہت جمیل ہے اور خوبصورت ہے۔ نوجوان جوڑے رات کو یہاں آ کر بڑی محبت کرتے ہیں آپس میں۔

ارباب نیاز نے اپنے نارمل رہنے کا احساس دلانے کے لیے کہا۔

ہاں محبت انسان کو ضرور کرنی چاہیئے۔

کامریڈ شان نے برجستہ داد دی۔ بلند آواز میں۔

شاباش، شاباش۔

آغا ناصر نے کامریڈ شان کو سمجھایا۔ بڑوں کے لیے شاباش کی بجائے بہت خوب کہتے ہیں۔

تو مَیں پھر معذرت کر لوں۔ کامریڈ نے مجھے پوچھا:

مَیں نے کہا۔

کوئی بات نہیں ارباب نیاز بھی تمھارے جتنی اُردو جانتے ہیں۔ اور آغا ناصر نے اُس کی مزید اصلاح شروع کی۔

دیکھو کامریڈ تم ہمارے صاحب اور تمھارے صاحب کہے بغیر اُردو سے چینی میں اور چینی سے اُردو میں ترجمہ سُنا دیا کرو۔

جی اچھا۔ کامریڈ شان نے کہا۔ مگر اس کے بعد کچھ بجھ گیا۔ غالباً اس

ایک سڑک پر جھیل کے بیچوں بیچ آگے نکل گئے۔ درختوں سے سائیکلیں ٹیک کر نوجوان جوڑے گھاس پر بیٹھے راز و نیاز میں محو ہیں۔ کچھ کی سائیکلیں گھاس پر لیٹی ہیں اور وہ درختوں سے ٹیک لگا کر محبت کے بیج بو رہے ہیں۔ کچھ بنچوں پر ایک دوسرے سے سر جوڑ کر خاندانی منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔ اور ہمارے ساتھ اُردو مترجم کامریڈ شان تھا۔ جس کی اُردو دانی کے سب قائل ہو چکے تھے۔ اس رومان پرور ماحول میں ہمیں اکھڑا اکھڑا سا محسوس کر کے بولا۔

صاحب یہ جگہ بہت حسین ہے۔ بہت جمیل ہے اور خوبصورت ہے۔

نوجوان جوڑے رات کو یہاں آ کر بڑی محبت کرتے ہیں آپس میں۔

ارباب نیاز نے اپنے نارمل رہنے کا احساس دلانے کے لیے کہا۔

ہاں محبت انسان کو ضرور کرنی چاہیئے۔

کامریڈ شان نے برجستہ داد دی۔ بُلند آواز میں۔

شاباش، شاباش۔

آغا ناصر نے کامریڈ شان کو سمجھایا۔ بڑوں کے لیے شاباش کی بجائے بہت خُوب کہتے ہیں۔

تو مَیں پھر معذرت کر لوں۔ کامریڈ نے مجھے پُوچھا:

مَیں نے کہا۔

کوئی بات نہیں ارباب نیاز بھی تمھارے جتنی اُردو جانتے ہیں۔ اور آغا ناصر نے اُس کی مزید اصلاح شروع کی۔

دیکھو کامریڈ تم ہمارے صاحب اور تمھارے صاحب کہے بغیر اُردو سے چینی میں اور چینی سے اُردو میں ترجمہ سُنا دیا کرو۔

جی اچھا۔ کامریڈ شان نے کہا۔ مگر اس کے بعد کچھ بجھ گیا۔ غالباً اس

احساس سے کہ ہم اُس کی اُردو سے مطمئن نہیں۔ اور یہ بات حکامِ بالا تک نہ پہنچ جائے۔ پھر ارباب نیاز اور افضل قادر مع اپنی بیگمات کے ہوٹل واپس چلے گئے۔ آغا ناصر کی بھی بیگم نہ تھی وہ فرینڈشپ سٹور میں جا گھسے مَیں اور حبیب الرحمٰن اور کامریڈ گھومتے رہے۔ مجھے کامریڈ کے بُجھ جانے کا احساس تھا۔ اور میں نے چاہا کہ اس کا اعتماد بحال ہو جائے۔

کامریڈ یہ جگہ یہ جھیل واقعی ایک خوب صُورت مقام ہے۔ تم نے اِتنی اچھی اُردو کہاں سے سیکھی؟

اس سے پہلے کہ کامریڈ کچھ جواب میں کہتا ایک لڑکی اور لڑکا سائیکلوں سے جلدی میں اُترے۔ سائیکلیں تیزی سے درخت کے ساتھ کھڑی کیں اور ایک مقناطیسی زور سے آمنے سامنے سر جوڑ کر ہاتھ ایک دوسرے کے ہاتھ میں دے کر بھینچ کر کھڑے ہو گئے۔

کامریڈ شان آپ واقعی شاندار لوگ ہیں۔ جنگ بھی مل کر کرتے ہیں۔ کھیتی باڑی بھی ایک ساتھ اور محبت بھی سر جوڑ کے کرتے ہیں۔

ہاں صاحب یہ اچھی بات ہے۔ کامریڈ بولا۔

کامریڈ تمھاری شادی ہو چکی۔ مَیں نے پُوچھا۔

ہاں صاحب ایک بچی بھی ہے۔ مَیں نے پھر پُوچھا۔

شادی سے پہلے سر بھی جوڑا تھا۔ حبیب الرحمٰن نے مُسکرا کر پُوچھا۔

سر جوڑا تھا تو جوڑی بن گئی تھی۔ کیوں ٹھیک نہیں مَیں نے کہا۔

کامریڈ نے حبیب الرحمٰن کو جواب دیا۔

مَیں پوچھتا ہوں نیچے جھیل کنارے والی بات۔ حبیب الرحمٰن شرارت کے موڈ میں تھا۔ ویسے ہم سب اسی موڈ میں تھے۔

جھیل کنارے کہاں صاحب۔ مَیں تو ہانگچو پہلی بار آپ کے ساتھ آیا ہوں۔ کامریڈ نے جواب دیا۔

واپس ہوٹل پہنچ گئے۔

بوڑھی میمیں، کھانگڑ صاحب، جاپانی، فرانسیسی، ڈچ، اطالوی، امریکی، ہندوستانی، برمی، نیپالی، افریقی تمام ممالک کے سیاح بریف کیس اٹیچی کیس لفافے اور بیگ اٹھاتے ارضِ چین کی جنت ہانگچو دیکھنے آ رہے ہیں۔ حبیب الرحمٰن اپنے انتظامی امور کے سلسلے میں چلا گیا۔ کامریڈ شان کو مَیں نے بھیج دیا اور لاؤنج میں بیٹھ کر سگریٹ نوشی کے مزے لینے لگا۔ پھر ہانگچو ہوٹل کے بُک سٹال کا خیال آیا تو تیسرے فلور پر وہاں پہنچا۔ چینی انگریزی رسالے کتابیں اُلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ اس ہوٹل کی کشادگی اور جھیل کے کنارے نے اس کی فضا میں بڑی فرحت بسا رکھی ہے۔ جی چاہتا ہے۔ بس گھومتے رہو۔ سو میں چینی مصوری کے شہکار جو جا بجا آویزاں تھے۔ دیکھنے لگا۔ میرے پاس لفٹ کا دروازہ کھُلا۔

ہیلو ینگ مین ۔۔۔ امریکی ۸۵ سالہ ڈشکرا تھا۔ جو مجھے دیکھ کر پکارا۔ بغل میں ایک اٹھارہ انیس سالہ برطانوی گلیمر گرل دباتے ہوئے لفٹ سے باہر آیا۔

کیسی ہے۔ مصوّر؟

خوبصورت۔ مَیں نے داد دی۔

ہاں یہ بہت خوب صورت ہے اور نو عمر بھی ہے۔ امریکی ڈشکرا سینہ پھیلا کر اور اپنے بازوؤں کے پٹھے اور بھی اُبھار کر بولا۔

ہاں واقعی ایسا ہے۔ نو عمر ہے۔ مگر صبح تک بوڑھیا بن جائے گی۔ انشاءاللہ تمھاری گپیں سُن سُن کر۔

میں نے کہا۔

او نہیں یہ مجھ سے بھی زیادہ باتونی ہے۔اُس نے کہا۔

باتونیوں میں بھی جنریشن گیپ ہوتا ہے۔میں نے کہا۔

تمھارے ساتھ کوئی لڑکی نہیں۔اُس نے پوچھا۔

ہے مگر میرے ساتھ ساتھ قدم اٹھاتی ہے۔میرے دل کے باغ میں۔ میں نے اُسے یقین دلایا۔

چھوڑو یہ افلاطونیت۔زندگی کی راہ میں بڑے شہر آتے ہیں۔ہر شہر میں مزا لینا چاہیئے۔اُس نے اپنا مسلکِ عشق بیان کیا۔

ہر شہر میں نیا دل بدل لینے سے تمام شہر ویران لگتے ہیں اور انسان تمھاری طرح محض گپ باز بن جاتا ہے۔

وہ یہ سُن کر پورے زور سے قہقہہ لگا کر لڑکی کی کمر میں بازو کا حلقہ اور تنگ کر کے اپنے کمرے کی جانب چلا گیا۔

حبیب الرحمٰن ٹیلیفون پر بیجنگ میں اپنے بچے اور بیوی سے گپ لڑا رہا تھا اور پاس بیٹھی ویٹرس سے چھیڑ خانی کرتا جاتا تھا۔میں نے کہا۔

حبیب الرحمٰن وہ امریکی گپی ہانگچو میں ایک جوان مچھلی پکڑنے میں کامیاب ہو گیا ہے بھائی۔

وہ بڑا حرامی ہے سالا۔اپنی صحت کا راز جانتا ہے۔حبیب الرحمٰن نے کہا۔

ویسے حبیب الرحمٰن تم ٹیلیفون پر بیوی سے بات کرتے ہو اور گپ لڑاتے ہو اس چینی گڑیا سے۔سنجوگ کی اس ایک گھڑی کے بعد ہجر کی لمبی رات کے قہر سے ڈرو۔

ارے نہیں۔حبیب الرحمٰن نے کہا۔

مَیں تو تمھارا تعارف اِس میٹھی لڑکی سے کروانا چاہتا ہوں۔
پھر حبیب الرحمٰن نے ویٹرس کو خلا میں اُنگلی سے چہرہ نما بنا کر میرا تعارف کروایا اور ویٹرس نے خوش ہو کر اپنے چہرے کے گرد اُنگلی گھمائی اور حبیب الرحمٰن سے متوجّہ ہوئی۔ حبیب الرحمٰن نے بتایا۔
یہ کہتی ہے میری تصویر بنائے گا اور مَیں نے کہہ دیا ہے۔ ہاں بنائے گا۔ اب تم اِس کی تصویر آج ضرور اپنے کمرے میں بنانا اور مَیں اِس بہانے سے اپنی بگڑی ہوئی تقدیر بنانے کی کوشش کروں گا۔
پھر حبیب الرحمٰن نے اُسے اشارہ کیا۔ وہ میرے کمرے کی چابی لے کر میرے آگے چل پڑی۔ چھوٹی سی گڑیا سی۔ سفید پینٹ جیکٹ اور ماؤ کیپ میں بہت معصوم سی لگ رہی تھی۔ اِس نے میرا کمرہ کھولا پھر روشنی کی اور فریج دکھایا۔ باتھ رُوم دکھایا۔ سلیپر بیڈ کے نیچے سے باہر نکالے اور مؤدب کھڑی ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔ مَیں نے شے شے کہا۔ وہ جواب میں شے شے بولی اور پلٹ کر دھیمے دھیمے دروازے میں جا کر رُکی اور پھر شے شے کہا۔ مَیں نے بھی پھر شے شے کہا اور وہ چلی گئی۔ اللہ غزلیق رحمت کرے عدم صاحب کیا خوب فرماتے ہیں۔

دیکھنا جھومنا دعا دینا
ہم یہی کاروبار کرتے ہیں

گرم پانی کا غسل کیا اور تولیہ لپیٹ کر کمرے کی گرم فضا میں فرحت محسوس کرتا گھومنے لگا۔ پھر کھڑکی کھولی اور ویسٹ لیک کا نظارہ کرنے لگا۔ میرے کمرے سے قائمہ زاویہ بناتے کمرے کی کھڑکی سے کُھلی پردے کریچ کر کے سمٹے اور امریکی ڈشکر الشیطان کی طرح پھر سامنے تھا اور اُس

کمرے میں اُس نوعمر حسینہ کو سٹرپ ٹیز سکھا رہا تھا۔ شاید اُسے بڑھاپے کا لباس پہنانا چاہتا تھا۔

مَیں نے اپنے کمرے کی کھڑکی بند کرلی۔ پر دل کی کھڑکی کُھل گئی۔

دل پرخوں کی اِک گلابی سے
عمر بھر ہم رہے شرابی سے
دل پرخوں۔ دِل پرخوں
دلِ ناداں دلِ ناداں۔ ناداں
دلِ ناداں کی بازیابی سے . . . .
کچھ تو فرصت . . . کچھ تو فرصت . . . .
کچھ تو فُرصت ملی خرابی سے
صحنِ مقتل میں جا . . . صحنِ مقتل میں جا نکلتی ہے۔
وہ گلی اُس کی بے نقابی سے
جانے کیا کیا کہاں گنوایا ہے
اے جنوں تیری ہمرکابی سے
سیرِ شہر . . . سیرِ شہرِ ستم . . . سیرِ شہرِ شعاراں میں
ہم تو پھرتے رہے شرابی سے
کشتِ دل کشتِ شب میں . . . .
صحنِ شب میں . . . کشتِ شب میں نجوم اُگتے ہیں
کشتِ شب میں نجوم اُگتے ہیں۔
تیرے پیکر کی آفتابی سے۔

巴中友谊万岁

۱۶

۱۹ر نومبر کی صبح ناشتے کے بعد ویسٹ لیک میں لانچ پر سیر کی۔ لانچ میں بیٹھتے ہی گرم گرم قہوہ اور کینو دیئے گئے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہَوا خوشگوار محسوس ہو رہی تھی۔ آسمان صاف اور جھیل کا پانی شفاف، کنول کے پھول اور سبز پتے اور مرغابیوں کے غول کے غول دھوپ میں مچا رہے تھے۔ ہانگچو شہر واقعی جس نے نہیں دیکھا اُس نے چین نہیں دیکھا۔ ہر چند کہ چینی میزبانوں کی اس شہر کی تعریف میں ہم نے ہاں میں ہاں ملائی۔ مگر یہ بتانا نہ بھولے کہ پاکستان میں لاہور نام کا ایک شہر زمانے میں مشہور ہے۔ اور جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا ہی نہیں ہُوا۔

ہانگچو صوبہ ژی جیانگ کا دارالسلطنت ہے اور تاریخ تقریباً دو ہزار سالہ پُرانی ہے۔ سانگ خاندان کے زمانے میں یہ شہر چین کا سب سے بڑا شہر تھا اور سیاحوں کی توجہ کا مرکز ہے۔ اطالوی سیاح مارکو پولو نے اس شہر کی تعریف یوں کہ کرۂ ارض پر جنت ہے۔ اور پریوں کے باغ کی طرح اس جہانِ فانی میں واقع ہے۔ سبز سبز پہاڑیاں، نیلا آسمان، پانی، ہَوا اور جھیل چینی کینو جنہیں چینی میزبان بیجنگ سے ہانگچو تک بڑے فخریہ انداز

میں پیش کر کے تعریفوں کے پُل باندھتے نہ تھکتے تھے۔ درمیانے سائز کا پھل زیادہ چھلکا سبز اور کہیں کہیں سے برائے نام نارنجی اور ذائقے میں بھی ترشی غالب مگر پھر بھی ہر چینی اس کا دیوانہ تھا۔ ہمارے ہاں کے کینو کے ڈھیروں میں سے بھی ایسے بہت نکلیں مگر پھر بھی کم نکلیں۔ ارباب نیاز نے انھیں پاکستانی کینو بھجوانے کا وعدہ کیا اور ہم اس جھیل کے ایک جزیرے ژدنگ شان پارک میں اتر گئے۔ دُنیا بھر کے پودے اور درخت اس جگہ بہار دکھاتے ہیں۔ اُس جزیرے میں چھوٹے چھوٹے تالاب جن میں سُرخ سنہری اور پیلی مچھلیاں کھیلتی ہیں۔ یہاں پورے ہانگچو پر ایک بھرپور نظر پڑتی ہے ہونہ ہو یہی جگہ ہے۔ جہاں سے مارکو پولو نے ہانگچو شہر کو دیکھ کر اسے جنت کہا تھا۔ یہاں ایک چھوٹے روایتی چینی طرز کے پیگوڈا نما کیفے میں کنول کا گرم گرم شیرہ پینے کو ملا۔ کیا چیز پی لی تھی کہ رگ و پے میں روشنی سی اُتر گئی۔ سگریٹ سُلگائی اور اکیلا کیفے سے نکل کر باہر کُھلی فضا میں سُرخ نارنجی پتوں والے سایہ دار درخت کے نیچے آ کر رُک گیا۔ میں نے آہستہ آہستہ اپنے چاروں اور اپنا کشکول نگاہ گھمایا۔ اِس شہر پر نیلا آسمان جس میں سفید بادل تیرتے ہیں۔ نیچے گہرے سبز، نیلے، گہرے نیلے پہاڑ اور پہاڑوں کے دامن میں درختوں کے جنگل جن میں رنگ برنگے مکانات اور اس سارے منظر کا عکس اپنے پانی میں اُتارتی جھیل اور جھیل کے قلب میں جزیرہ —— جہاں سحرِ فطرت، دھیان کو مرتکز کرتا ہے۔ اور لہر لہر دائرہ دائرہ گیان کو کھولتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے فطرت فی الواقع سکون واطمینان اور یکسوئی کے حصاروں میں ہوا پانی دھوپ، کے خمیر سے کسی جنت کی صورت گری میں رازداری برت رہی ہو۔ یہاں وہ چند لمحے بھی آئے جو

مجھ پر طاری نہ ہو سکے بلکہ میری مراجعت کے منتظر رہے۔ مجھے اپنے تسلسل میں سمونے کے لیے معطل رہے۔ وہ چند لمحے جو لافانی ہیں۔ انھیں اس حیات سے الگ سمجھنا چاہتا ہوں کہ یہ حیات فانی ہے اور حیاتِ فانی تو خود ایک وقفہ ہے یہ کسی تعطل کی متحمل نہیں ہو سکتی ـــــ میرا بدن شکن در شکن تہ در تہ سمٹ کر گھاس پر رہ گیا تھا۔ مَیں فی الواقع زمین سے اُٹھ گیا تھا۔ چاروں اور پھیل گیا تھا۔ تمام رنگ میرے تصرف میں اور ہر خوشبو میری مُٹھی میں تھی۔ مَیں نے ہَوا کے گیت سُنے اور کرنوں کا تاج پہنا تھا ـــــ ان لمحوں کا احساس تب ہُوا تھا۔ جب مَیں نے دوبارہ یہی بدن کا لباس پہنا تو جیب و داماں میں ہزار دُکھ تھے۔ زخم تھے۔ مَیں نے دیکھا آغا ناصر مجھے عجیب کیفیت میں دیکھ کر مضطرب تھا۔ شاید وہ میرے ہی جیسی کسی کیفیت کے کسی کنارے پر جا کر لَوٹ آیا تھا۔

آغا ناصر یار کار لائل سے کسی نے پوچھا کہ میاں صاحب تمھارے یوٹوپیا میں آخر لوگ کریں گے کیا؟ تو اس نے کہا تھا۔

"لمبی لمبی پیار بھری باتیں۔ کبھی نہ ختم ہونے والی باتیں۔"

مگر ہمارے چینی ہمیں کاروں کی جانب بڑی جلدی سے بلا رہے تھے۔ بس ہم چند منٹ کی ڈرائیو سے پیگوڈا آف سکس ہارمینز پہنچ گئے۔ اس پیگوڈے کے دامن سے اس کی بلندی پر نظر ڈالنے کے لیے سر کی ٹوپی گرانے کے ساتھ اُلٹ بازی بھی لگانی پڑتی ہے۔ یہ پیگوڈا ۹۷۰ عیسوی میں سانگ خاندان کے عہد میں تعمیر ہُوا۔ ۱۱۵۶ء میں اس کی تعمیر دوبارہ ہوئی اور انقلاب کے بعد اسے مستحکم کیا گیا۔ اس کی ۱۳ منزلیں ہیں۔ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ مگر تیسری منزل تک گئے کہ دیگر سیاحوں کے ساتھ ہمیں بھی روک دیا گیا۔

شاید انقلاب کے بعد اسے دوبارہ مستحکم کرنے کا ارادہ تھا۔
یہاں سے اُترے اور دریائے کیان تنگ کے کنارے کنارے چلتے کے باغات میں پہنچے۔ پہاڑی ڈھلوانوں پر چائے کے باغات اِس قدر خوش منظر ہیں کہ چائے کے سمندر پیتے ہوئے لوگوں کے دل میں چائے نوشی کے لیے ایک نیا حوصلہ پیدا ہوتا اور ساتھ ہی جذبۂ رقابت بھی جاگتا ہے اُن کے لیے جو دوشیزہ کے ہونٹوں جیسی گرمی اور مٹھاس والی اس معصوم شے کو ترک کرنے کے مشورے دیتے اور موٹی موٹی کتابوں سے حوالے لاتے ہیں۔ ذرا یہ باغات دیکھ لیں تو ماتم کریں اپنی کور ذوقی کا جسے وہ عقلمندی سمجھے بیٹھے ہیں۔ ذوق اللہ کی خاص دین ہے۔ عقل سے محروم تو وہ کسی کو نہیں کرتا۔ اس کے ساتھ ہی بانس کا جنگل شروع ہو جاتا ہے جو میرے لیے خاص دلچسپی کا سامان رکھتا تھا۔ چینی مصوری میں بانس کا تنا اور پتے وہی کام کرتے ہیں۔ جو آرکسٹرا میں طبلہ، ایک پُرانی جھونپڑی کے ساتھ شروع ہو کر جنگل میں جاتی پگڈنڈی چینی پینٹنگز اور ایمبرائیڈری کے نمونوں میں بارہا دیکھ چکے ہیں۔ اِس پگڈنڈی کے دونوں جانب بانس کا جنگل ایک سبز چتکبرا اور بھیگا بھیگا حسن رکھتا ہے۔ ایک مہک ہلکے ہلکے دلوں کو چھیڑتی ہے۔ سکون ہی سکون اور خاموشی ہی خاموشی۔ یہ پگڈنڈی جو اس جنگل کے بیچوں بیچ گزرتی ہے۔ چائے کے باغات سے آہستہ آہستہ چڑھائی چڑھتی اختتام تک جاتی ہے۔ سیاہ پتھر کی سلوں سے بنی ہے۔ اور جنگل کے گہرے سبز حُسن میں اس پگڈنڈی کا ہر مسافر اپنے کسی نہ کسی خواب کے کنارے جا نکلتا ہے۔ سترہ سالہ مونا لیزا کا پچاس سالہ عاشق لیونارڈ ڈ ونچی اپنے ایام دل زدگی میں کہاں کہاں نہ مارا مارا

پھرتا تھا۔ اس نے چین میں بھی آوارگی کی۔ یہ معلوم نہیں کہ ہانگچو آیا اور اس نے یہ پگڈنڈی دیکھی کہ نہیں لیکن مونالیزا کے دائیں کاندھے سے پھوٹ کر بل کھاتی کسی جھیل کنارے سرکنڈوں میں گم ہوتی پگڈنڈی کا سحر اس پگڈنڈی کا ہمزاد ہے۔ میں اس پگڈنڈی کے ٹھنڈے ٹھنڈے ماحول میں نہ جانے کن کن جگہوں میں دلگیر پھرتا تھا کہ کامریڈ لن کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ پوچھتا تھا۔

اس عورت کی کیا عمر ہے؟

بالوں کی دو چوٹیاں شانوں پر گرائے نیلی پینٹ جیکٹ میں ملبوس درمیانے قد کی ہشاش بشاش لڑکی تو ہمارے ساتھ نہ تھی۔ یہ اس جنگل میں کہاں سے نکل آئی۔ میں نے اس کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ یقین نہ آتا تھا مگر مسٹر لن کے سوال میں عورت لفظ کو سہارا بنا کر عمر بتاتی۔

پچیس سال۔

اور کامریڈ لن سے درخواست کی کہ اگر میرے قیافے میں یہ عمر اس کی اصلی عمر سے بہت زیادہ ہو تو ٹال جاؤ۔ آخر عورت ہے۔

کامریڈ لن نے اُسے میرا قیاس بتایا تو وہ کھلکھلا کر ہنسی اور یکدم اور بھی حسین ہو گئی۔ اُس نے جھک کر میرا شکریہ ادا کیا۔ شے شے۔

تب کامریڈ لن نے بتایا۔ اس کی عمر بیالیس برس ہے۔

یہ سُن کر ہم اُسے دیکھتے رہ گئے وہ کھلکھلا کر ہنستی ہوئی حسین سے حسین تر ہوتی چلی گئی۔ چمکدار پورے دانت، روشن آنکھیں، سُرخ سفید رنگت، سڈول جسم چست و چالاک زندگی سے بھرپور بیالیس سالہ عورت ہی ایک مستعد اور محنت کش سرزمین کی مونا لیزا ہو سکتی ہے۔ جس کا حُسن

اتنا پائیدار ہو کہ وہ اینٹیں اُٹھا سکے، چنائی کر سکے، ٹرک چلا سکے، ٹریکٹر چلا سکے، فصل کاٹ سکے، سر پر منوں بوجھ اٹھا کر چل سکے اور محبوب اگر رزق کی تلاش میں دُور دیس گیا ہو تو اس کی امانت اپنے حسن و جمال کی حفاظت برس ہا برس کر سکے بغیر کوئی دانت گرائے کوئی ایک بال بھی اپنے سر کا سفید نہ ہونے دے اور آنکھوں کی پوری چمک سنبھال سکے لمحۂ وصال تک ـــــ چین کتنا مختلف خطۂ زمین ہے ـــــ اس جنگل میں ایک اور قسم کے بہت سارے درخت پگڈنڈی کے ساتھ رنگ برنگے پتوں اور پھولوں والے ہیں۔ بہت تناور ہیں۔ اور ان میں سے بیشتر کی عمریں ہزار سال بتائی جاتی ہیں۔ جنگل کی سیر کو سب نکلے تھے۔ کس کس نے درخت گنے اور درختوں کے اسرار کس نے سمیٹے، کون جنگل میں گُم ہُوا۔ کس نے راستہ پایا۔ سگمنڈ فرائڈ کے بقول کون دیوانہ اور کون فرزانہ تھا۔ یہ تفریق ہونے کی نوبت چینی یاروں نے آنے ہی نہ دی۔ سب کو گھیر گھار کر لے آتے تھے۔

ہانگچو ہوٹل میں کھانا کھایا اور چند لمحے آرام بھی نہ کیا کہ ہانگچو کی ایک مادام اور حبیب الرحمٰن کے ساتھ کچھ کاغذ کچھ رنگ اور کچھ اور خریدنے روانہ ہوئے۔ جھیل کنارے چلتی کار مادام نے ایک جگہ رکوائی اور ہمیں ساتھ لے کر شملہ پہاڑی طرز کے ایک ٹیلے پر چڑھنے لگی۔ کیا بھول بھلیاں تھیں۔ پتھروں اور درختوں کی فنکارانہ تراش خراش دیکھنے کی بات تھی۔ اندر داخل ہوئے تو وہ ایک ڈرائنگ میٹریل سٹور تھا۔ اس سٹور تک رسائی ایسے پُر تکلف راستوں سے اللہ اللہ یہ سلیقہ یہ قرینہ کہ ان راستوں سے گزرتے گزرتے ایک سیدھا سادا انسان بھی مصوّر بننے کے ارادے

باندھنے لگے۔ کچھ واٹر کلر پیپر خریدنے۔ کچھ گاش کی بوتلیں خریدیں۔ پھر اگلے سٹور پر اور اس کے بعد تیسرے اور چوتھے سٹور پر۔ اس خرید و فروخت کے بعد ایک پُر ہجوم چوک میں ہم نے چینی ریوڑیاں اور گجک کھائی اور کاجو کی خستگی کا لطف اُٹھایا۔ بعد میں فرینڈشپ سٹور سے ولید کے لیے اونی سوٹ، سعدیہ کے لیے روایتی چینی لباس، فہیم کے لیے جیکٹ اور پردین کے لیے کُھلا کپڑا خریدا۔ پھر کار ایک جگہ کھڑی کر کے ہانگچو کی سیر بس نمبر ۱۱ پر خوب خوب کی۔ پیدل مارچ کرنے کو بس نمبر ۱۱ کہتے ہیں۔ جیسے ہمارے لاہور میں پاگل خانہ کے لیے بس نمبر ۴ مخصوص ہے۔ پھر ہانگچو کا پیپلز سکوائر دیکھا۔ ایک نمائش گاہ دیکھی۔ واپس آتے تو شام کے کھانے کا وقت ہو رہا تھا۔ ہانگچو کے میئر نے کھانا دیا۔ جامِ صحت اور تقریریں۔ خیر سگالی کے جذبات کا اظہار اور ہانگچو کے حسن و جمال کی تعریف میں شاعری ہوئی۔

تھوڑی دیر ہانگچو ہوٹل کے فرینڈشپ سٹور میں نوادرات دیکھتے رہے۔ جو خرید سکتے تھے انھوں نے خریداری بھی کی۔ پھر سب واپس اپنے اپنے کمروں کو چل دیئے۔

میں چوتھے فلور پر پہنچا تو پھر وہ چینی گُڑیا مجھے دیکھتے ہی چابی لے کر میرے آگے آگے چل دی۔ کھڑاک سے ایک کمرے کا دروازہ کُھلا۔ ایک جاپانی تیزی سے باہر نکلا اور زبردستی اس چینی گُڑیا کے ہاتھ میں کچھ تھمانے کی کوشش کی۔ جسے چینی گُڑیا نے جھٹک دیا۔ مجھے سونے کے خول چڑھے دانتوں والے اس جاپانی کی اِس حرکت پر سخت طیش آیا۔ اور مَیں نے بدمعاش، لُچّے، لفنگے، شورے، اُچکے اور غنڈے جیسے القابات

سے اُسے نوازا —— وہ میری طرف کھی کھی کرتا ہُوا کھسیانی ہنسی ہنستا رہا۔ تب مجھے خیال آیا کہ یہ سب گالیاں جو میری تالیفِ قلب کا باعث ہوئیں۔ سب بیکار گئیں اور یہ تو شاید مورا دور —————۔ والی زبان بھی نہ سمجھے گا۔ آزمانے کے لیے مَیں نے اُسے پوچھا" ہاؤ ڈو یو ڈو" وہ کچھ سمجھ گیا اور فوراً بولا۔" ویری گڈ" اور آداب عرض کرنے کے انداز میں واپس کمرے میں گھُس گیا۔ مَیں اپنے کمرے میں پہنچا تو چینی گڑیا دروازہ کھول کر روشنی کیے درمیان میں کھڑی تھی۔ مَیں اندر داخل ہوا تو اُس نے اپنے چہرے کے گرد اُنگلی گھمائی۔ مَیں سمجھ گیا۔

مَیں نے پیڈ نکالا اور چند منٹ میں اُس کا پروفائل بنا کر اُسے دے دیا۔ وہ خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھی۔ زمین پر بالکل پتلی کی طرح اُچھلنے کودنے لگی۔ مَیں دیکھتا رہا۔ پھر کچھ بولی۔ جس میں سے صرف شے شے سمجھ سکا۔

مَیں نے بھی کہا۔ شے شے۔

شے شے۔ وہ پھر بولی۔

شے شے۔ مَیں نے ذرا لٹکا کر اَدا کیا۔

وہ شے شے کہتی نہ رُکتی تھی اور بڑی احسان مند نظروں سے مجھے دیکھتی جا رہی تھی اور مجھے یہ دقّت آن پڑی تھی کہ اسے کِس طرح کہوں کہ تمھارا شکریہ قبول ہوا۔ اب جاؤ —— لیکن وہ چند قدم اِدھر گھوم کر پھر قدرے جھکتی اور شے شے کہتی۔ اپنے اسکیچ پر انگلی گھما کر پھر اپنے چہرے کے گرد انگلی پھیرتی اور آنکھیں خوشی سے پھاڑ پھاڑ کر داد دیتی جو میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ حبیب الرحمٰن بول رہا تھا۔

کہہ رہا تھا۔ مجھے کل صبح می شوشو تے ژدین ہانگچو کا دورہ کرنا ہے یَں نے کہا۔
اچھے بچے حبیب الرحمٰن یہ می شوشوئے ژدین کا مطلب تو بعد میں پوچھوں گا۔ یہ چینی گڑیا کو مَیں نے اس کا اسکیچ بنا دیا ہے۔ وہ درمیان میں بلند آواز میں بولا۔ شاباش نوک پلک بالکل درست کر کے چھوڑنا۔ اور اگر کوئی خامی رہ گئی ہے تو کہہ دو فنشنگ ٹچ مجھ سے لگوا لے۔
ادمیرے بچے حبیب الرحمٰن میری بات سنو۔ مَیں نے اس کا اسکیچ بنانے میں اتنی دیر نہیں۔ جتنی دیر سے وہ میرا شکریہ ادا کر رہی ہے۔ شے شے کی رٹ ختم ہونے میں نہیں آ رہی۔ مَیں اسے ٹیلیفون دیتا ہوں۔ تم اسے چینی میں کہہ دو کہ مَیں اُس کا شے شے قبول کر چکا۔ اب وہ اپنی ڈیوٹی پر واپس جائے۔
اچھا تو مشکل میں ہیں آپ دیں اُسے۔
مَیں نے چینی گڑیا کو رسیور دیا تو وہ سخت گھبرا گئی۔ مگر پھر اُسے حبیب الرحمٰن کی آواز سُن کر اطمینان ہُوا۔ میری تعظیم میں جُھکی شے شے کہا۔ دھیمے دھیمے دروازے تک گئی پھر پلٹ کر جُھکی اور شے شے کہہ کر چلی گئی۔
مَیں نے لباس تبدیل کیا اور ویسٹ لیک کی جانب کھڑکی کھول کر وہ جزیرہ جو اب ایک سیاہ قریہ تھا اُس میں اُس درخت کو تلاش کرنے کی کوشش کی۔ جس کے پتے سُرخ پیلے اور نارنجی تھے۔ جہاں مَیں نے اپنا کشکولِ نگاہ چاروں اور گھمایا تھا۔ اس شہر پر نیلا آسمان جس میں سفید بادل تیرتے ہیں۔ نیچے گہرے، سبز، گہرے سبز، نیلے۔ گہرے نیلے پہاڑ، پہاڑوں کے دامن میں درختوں کے جنگل جن میں رنگ برنگے مکانات اِس سارے منظر کا عکس اپنے پانی میں اتارتی جھیل اور جھیل کے قلب میں یہ جزیرہ

جہاں دھیان لہر لہر مرتکز ہوتا ہے اور گیان دائرہ دائرہ پھیلتا ہے۔ لیکن جب وہ درخت مجھے اس وقت دکھائی نہ دے سکا تو مَیں نے اپنے کشکولِ نگاہ کی ریزگاری کا میزان کیا۔ تب دھیان کی کھڑکی گیان میں کھلی اور گیان کے آخری اُفق پر وہ ستارا چمکا جو استعارہ ہے کسی جنتِ گم گشتہ کا جس کی تلاش میں انسانی متخیلہ پر پرواز کھولتی ہے۔ ہر اُس شانت لمحے میں جو بڑا کمیاب ہے کہ ہر نئی ابجد صدیوں کی گویائی کے خمیر سے اُٹھتی ہے اور انسانی حواس سے شناسائی پیدا کرنے کے لیے زمانوں کا تسلسل درکار ہوتا ہے۔ تب پرندوں کی چہکار میں ترنم کا احساس ہوتا ہے۔ ہَوا کی سرسراہٹ میں سُر کی پہچان ہوتی ہے۔ پتوں پر تحریروں کا مفہوم سمجھ میں آتا ہے۔ اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے سبز سرمئی چمپئی رنگوں والے ابر و باد، برگ و بار، مُرغ و ماہی اور آب و گِل کے شہر اہلِ چین کی جنتِ ارضی ہانگچو کی جھیل کے قلب میں اُس جزیرے پر مَیں نے پھر نظر ڈالی جہاں سورج کی شعاعوں کا کھیل دیکھنے کی عادی آنکھ شعاعوں کے تعاقب میں آسمان کی جانب بھی اُٹھ ہی جاتی ہے۔

ما از خدائے گم شدہ ایم او بجستجوست
چوں ما نیاز مند و گرفتارِ آرزوست
گاہے بہ برگِ لالہ نویسد پیامِ خویش
گاہے درونِ سینۂ مرغاں بہ ہاؤ ہوست

巴中友谊万岁

۱۷

۲۰ نومبر کی صبح بیدار ہُوا۔ غسل اور شیو کے بعد زیادہ ہی گرم کپڑے پہنے کہ گزشتہ شب سے ہانگچو کا موسم بھی بہت سرد ہوگیا تھا۔ کافی کا کپ پکڑا اور کھڑکی کھول کر ویسٹ لیک پر سورج کی کرنیں بکھرتی دیکھنے لگا۔

پھر ناشتہ کے لیے تیسرے فلور پر اُترا۔ ناشتہ کے بعد چی چیانگ می شوشوتے ژدین ہانگچو ZHE Jinng Academy of Fine Arts Hang Zhou کے لیے روانہ ہوئے۔ جو ہانگچو ہوٹل سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔ روایتی چینی مصوری کے مشہور زمانہ مصور تن پائی Tin Pai جو اس اکیڈمی کے وائس پرنسپل ہیں۔ چشمہ لگائے نیلا مفلر گلے میں ڈالے استقبال کے لیے آئے۔ اس درس گاہ میں پینٹنگ ڈیزائننگ، کیلی گرافی، سکلپچر اور دڈکٹ کے شعبوں میں طلباء اور طالبات کی کثیر تعداد زیر تعلیم ہے۔ یہ اکیڈمی چین کی سب سے بڑی فنون کی درس گاہ ہے۔ یہاں ۲۳۰ غیر ملکی طلباء ہیں۔ ۱۷۰ اساتذہ ۸ پروفیسر ۲۰ نائٹ پروفیسر اور خاص تجربہ اور مہارت رکھنے والے ۸۰ استاد ہیں۔ جاپان کے ساتھ جنگ کے دوران اس اکیڈمی پر کافی کڑا وقت گذرا اور یہ اکیڈمی چین کے مختلف شہروں میں

نقل مکانی کرتی پھری ۔ ثقافتی انقلاب میں بھی کڑی آزمائش سے گزری ۔
اب اس کے حالات سازگار ہیں ۔

ہمیں تمام شعبے دکھائے گئے اور ہر شعبے میں درس و تدریس کا طریقِ کار سمجھایا گیا ۔ طلباء اور طالبات کو مصروفِ فن دیکھا ۔ اساتذہ کا معلّمانہ خلوص اور طلباء کا انہماک قابلِ ستائش ہے ۔ تربیت کے جتنے کڑے مدارج اور مراحل اس درس گاہ کے ہیں اور جس قدر محنت کروائی جاتی ہے ۔ اس کی بنا پر یہ نتیجہ بآسانی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے ملک کے برعکس چین میں کوئی جعلی آدمی فنونِ لطیفہ میں نہیں گھس سکتا ۔ اس درس گاہ میں روایتی اور جدید مصوری دونوں کی تدریس کا انتظام ہے ۔ چین کی جدید مصوری میں اب مغربی اثرات بکثرت جگہ پا رہے ہیں ۔ مَیں نے یہاں کسبِ کمال اور خطِ کمال کا مظاہرہ کیا ۔ کسبِ کمال کی داد تو فوراً مل گئی مگر خطِ کمال میں وہی شینگ ہائی والا مسئلہ تھا کہ رنگ و خط کی تفہیم تو جلد ہو جاتی ہے ۔ مگر اب جو نسل زیرِ تعلیم و تربیت ہے اُس کے لیے عبارت کا مفہوم قطعی طور پر اجنبی اور تعجب انگیز ہے چونکہ ہماری فنکارانہ خطّاطی کا پسندیدہ مواد آیاتِ قرآنی ہیں اور چینی بھائی تو آسمان کی سمت دیکھتے ہی نہیں ۔ وہاں سے اُترنے والی کتابوں کا اُن کے ہاں تصوّر بھی ناپید ہے ۔ خطِ کمال کے تزئینی عناصر یعنی مُسلم فنِ تعمیر کے گنبد و مینار اُن کی سمجھ میں نہ آتے ہوئے دیکھ کر مَیں نے مشہور چینی خطاط اور اِس درس گاہ کے استاد کامریڈ لیو چیانگ کو زحمتِ فن دی ۔ انھوں نے ایک مشہور نظم جو وطن کی محبت میں ہے ۔ اس کے دو اشعار لکھے ۔ تو مَیں نے برش سے اس خطاطی کو پینٹنگ میں بدل دیا ۔ پگوڈے کنول کے پھُول ، پہاڑ ، دریا اور بانس کی شاخیں دیکھ کر انھوں نے خوب

داد دی اور میرے گنبد و مینار کا ابلاغ ہونے لگا۔ مَیں نے یہ تصویریں اِسی شعبے کو پیش کر دیں اور شے شے کی آوازوں کا رس کانوں میں گھُلنے لگا۔

اس درس گاہ میں دو پاکستانی لڑکیاں بھی زیرِ تعلیم ہیں۔ مِس تانیا ثانی اور مِس سیمیں اعجاز خاں۔ جن سے اُن کی تعلیم کے بارے میں بھی تبادلۂ خیال ہوا۔ دونوں بڑی لگن سے فن سیکھ رہی ہیں۔ انھوں نے مجھ سے پاکستان میں اپنے مستقبل کے بارے میں پوچھا۔ جو مَیں نے تابناک بتایا۔

اِس اکیڈیمی سے نکل کر سیدھے ہانگچو ہوٹل آئے اپنا سامان گاڑی میں رکھا تاکہ مزید سیر و سیاحت کے بعد سیدھا ہانگچو ریلوے سٹیشن پہنچ جائیں۔

ہانگچو مصوّروں اور شاعروں کا شہر ہے۔ ہر قدم پر ایک نیا احساس حُسن اور انوکھا پن دکھائی دیتا ہے۔ ویسٹ لیک کے کنارے خوشنما راہداری ہے۔ جس پر تھوڑے فاصلے پر دیدہ زیب پویلین ہیں۔ جہاں سے سیّاحوں کو ریفریشمنٹ مِل سکتی ہے۔ ہانگچو کے آسمان سے جنگی طیاروں کی پرواز کی آواز بھی آتی رہتی ہے۔

جھیل کنارے ایک ٹیلے کے دامن میں ایک سفید براق مجسمہ دعوتِ دید دیتا ہے یہ اُس انقلابی خاتون کا ہے۔ جس نے اِس علاقے میں بادشاہت کا تختہ اُلٹنے میں مرکزی کردار اَدا کیا تھا۔ مَیں نے چند پھُول توڑ کر اس کے قدموں میں رکھ دیئے۔ ویسٹ لیک کے کنارے ہانگچو ہوٹل سے ملحق ایک ہیرو جرنیل کا ٹمپل اور قبر ہے۔ دیکھنے کی چیز ہے۔ اِس یادگار میں داخل ہوں تو ایک خوب صُورت قطعۂ زمین کے آگے ٹمپل ہے۔ جس میں یوی فی Eue Fie کا دیو ہیکل مجسمہ ہے۔ یوی فی (۱۱۰۳-۱۱۴۲) عیسوی میں جنوبی سانگ خاندان کا فوجی جرنیل تھا۔ شمالی حملہ آور تاتاریوں کے خلاف مردانہ وار

لڑا۔ بعد میں چاؤ گو کے عہد میں ہانگچو کی جیل میں اس پر مقدمہ چلا اور پھانسی پر چڑھایا گیا۔ آٹھ سو سال سے چینی لوگ اسے خراجِ عقیدت پیش کرنے آتے ہیں۔

ٹمپل کے دائیں جانب اس کی قبر ہے جس پر ۳ فٹ اینٹوں کی چنائی پر مٹی کے گول ڈھیر پر سبز گھاس اُگی ہے۔ اِس قبر کے پہلو میں ایسی ہی مگر چھوٹی قبر اُس کے بیٹے کی ہے۔ قبر تک راستے میں دورویہ دانشوروں کے مجسمے آمنے سامنے تعظیماً کھڑے ہیں۔ ذرا پیچھے ہٹ کر گھوڑے بیل اور شیر کے مجسّمے ہیں۔ ایک کونے میں غدار چاؤ گو اور اس کی بیوی کے مجسّمے ذلّت و رسوائی کی علامت بنے سرنگوں ہیں۔ لوگ ان پر تھوکتے ہیں۔ ہم نے بھی لعنت بھیجی۔

یوی فی کے ٹمپل کے دروازے سے ٹیک لگائے ایک چینی ماں اپنے شیرخوار بچے کو بڑے نارمل انداز میں اپنی چھاتی ننگی کیے دودھ پلاتے دیکھ کر یاد آیا۔ کنفیوشس نے کہا تھا۔ "اس دُنیا میں ہر آنے والا بچہ اِس بات کا ثبوت ہے کہ خدا ابھی انسان سے مایوس نہیں ہوا"۔

یہاں سے سیدھے ہانگچو ریلوے سٹیشن پہنچے۔ وی آئی پی لاؤنج میں ارباب نیاز، بیگم ارباب نیاز، افضل قادر، بیگم افضل قادر، حبیب الرحمٰن کامریڈ شان اور مادام چنگ سب منتظر تھے۔ بارہ بج کر پچاس منٹ پر ہانگچو سے شنگھائی کے لیے ریل کی روانگی تھی اور بارہ بج کر پینتالیس منٹ پر پلیٹ فارم کے قرب و جوار میں بھی ریل کا نشان تک نہ تھا۔ آغا ناصر نے لاہور ریلوے سٹیشن کا وہ معروف لطیفہ سنایا۔ کہ ایک گاڑی آتے دیکھ کر مسافروں نے خوشی سے تالیاں بجائیں کہ شکر ہے آج تو گاڑی وقت

پر آ ہی گئی۔ مگر پاس سے ایک محرمِ راز نے بتایا۔ بھائیو! یہ وہ گاڑی ہے جس کو گزشتہ کل یہاں اس وقت پہنچنا تھا۔

ہاں ہم پاکستانیوں کی برکت سے یہاں بھی تھوڑی بہت تاخیر تو ضرور ہو گی۔ حبیب الرحمٰن نے کہا۔

مگر ہم پاکستانی چین میں بابرکت ثابت نہ ہوئے۔ ۱۲ بج کر ۴۷ منٹ پر گاڑی پلیٹ فارم پر آ کر رُک گئی ٹکٹ پر پلیٹ فارم کا سیکشن بھی درج ہوتا ہے۔ مسافر وہاں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ریل کا ڈبہ بھی بالکل اُن کے سامنے آ کر رُکتا ہے۔ مسافر ایک دروازے سے داخل ہوتے ہیں اور اُترنے والے دوسرے دروازے سے نکلتے ہیں۔ ہمارے ہاں کا منظر جس میں کچھ مسافر سامان اُٹھائے اپنے ڈبے کی تلاش میں پیچھے اور آگے کو بھاگتے ہیں۔ ٹکراتے ہیں اور ایک طوفان بدتمیزی پیدا ہوتا ہے۔ چین کے ریلوے اسٹیشنوں پر یہ عالم ناپید ہے۔ گاڑی کے سوار مسافر اگر اپنی منزل پر اُترنے میں کسی وجہ سے ذرا لیٹ ہو جائیں تو پھر وہ کھڑکی سے کودتے ہیں۔

۱۲ بج کر پورے ۵۰ منٹ پر ریل گاڑی ہانگچو سے شنگ ہائی کے لیے روانہ ہو گئی۔

گاڑی کی بریک تو ٹھیک ہے نا؟

ہم نے مادام جنگ سے ازراہِ مذاق پوچھا مگر وہ سنجیدہ ہو کر اور قدرے متفکر بھی ہو کر اٹھی اور باقاعدہ پتہ کر کے آئی کہ بریک بالکل ٹھیک ہو چکی ہیں۔ پھر اس نے لنچ باکس کھولے اور ہمارے سامنے بڑی مادرانہ شفقت سے سجانے لگی۔ اس لنچ کا بہت مزہ آیا۔ مختصر تھا مگر بھرپور۔

باہر دہی تاحدِ نظر کھیت ہریادل سے لدے ہوئے ۔ ندی ، نالوں نہروں اور دریاؤں کا ولولہ انگیز منظر۔ چینی دہقان قطار اند قطار کشتِ رزق افروز کے کنارے کنارے

چینی کاشت کار زمین کا چپہ چپہ کاشت کرتے ہیں ۔ وہ کم سے کم جگہ پر کھیتی اُگا لیتے ہیں ۔ اتنے سلیقے اتنے قرینے سے اور نگہداشت بڑے خلوص سے کرتے ہیں۔ فصل کو لمحہ لمحہ بڑھتے دیکھتے ہیں اور کھیتی زمین کے سینے پر شیر خوار بچّے کی طرح ہمکتی دکھائی دیتی ہے۔

چینی دہقان کا ایمان ہے کہ زمین ماں ہے ۔ وہ اِس یقین سے بیج بوتا ہے کہ زمین بڑی سخاوت کرنے والی ہے ۔ وہ فصلوں کی پرورش سو کروڑ چینی آبادی کو مدِّ نظر رکھ کر کرتا ہے ۔

وہ فصل کاٹتا اور سمیٹتا ہے۔اس احتیاط اور ذمّہ داری سے کہ ایک بھی دانہ ضائع نہ ہو۔

چینی دہقان کھیت کنارے قطار اندر قطار چلتے ہیں ۔ مؤدب ہوکر جیسے ماں کے قرب میں ہوں ۔ وہ کام ختم کرکے دھیمے دھیمے گھروں کو لوٹتے ہیں ۔ جیسے زمین رزق اُگلتی رہے آہستہ آہستہ۔

ہانگچو اور شینگ ہائی کے عین درمیان چاسی نام کا ایک قصبہ ہے ۔جس کی آبادی تقریباً دو لاکھ ہے ۔ یہاں ٹریکٹر سازی کی صنعت ہے ۔

ساڑھے چار بجے شینگ ہائی پہنچ گئے ۔ شینگ ہائی کی میزبان جماعت نے خوش آمدید کہا یوں لگا جیسے واپس گھر پہنچ گئے ہیں ۔ شینگ ہائی پیپلز سکوائر سے گزرتے جنگ جیانگ پہنچے ۔اس بار رہائش فرانسیسی طرز کے حصّے میں ملی ۔ ہمارا سامان ہمارے کمروں میں پہنچ چکا تھا۔ کمرہ نمبر ۵۶ گیارویں

فلور پر ملا۔ شام کا کھانا کھایا اور پنگ لی جو چنگ میں چینی سرکس دیکھنے پہنچے۔ چینی قلا بازوں کا تو زمانے بھر میں جواب نہیں۔ ان کی پھرتی مہارت اور چابکدستی کو بس دیکھتے جاؤ اور ہم چُپ چاپ دیکھتے رہے ویسے بہت سوں کا مُنہ کھُلا ہی رہا ہو تو یہی دادِ فن شمار کیجئے۔

ہاف ٹائم میں آئس کریم سے تواضع ہوئی۔ شینگ ہائی کی شدید سردی میں آئس کریم نے وہ مزا دیا کہ اور بھی طلب کی۔ واپس آئے کچھ خطوط لکھے پھر کپڑے بدلے اور کھڑکی کا پردہ سرکا کر شینگ ہائی شہر پر نظر ڈالی تو ایک سکوت کی چادر شہر ہنگامہ پرور پر تنی تھی ؎

سو گئی شہر کی ہر گلی سو رہو سو رہو

۱۸

۲۱ رنومبر کی صبح ذرا دیر سے آنکھ کھلی۔ جلدی جلدی تیاری کی پھر کافی کے چند گھونٹ لیے۔ سگریٹ سلگایا اور کھڑکی ہیں سے باہر جھانکا۔ تو سارا شہر لاہور جیسا لگا۔ کیونکہ سامنے مینارِ پاکستان دکھائی دے رہا تھا۔ غور سے دیکھا تو مینارِ پاکستان سے مشابہ مینار کی بالائی دو منزلیں تو بالکل دیسی ہیں۔ مگر زیریں حصّہ چوکور اور محرابوں والا ہے۔ بعد میں پتہ کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ شینگ ہائی میونسپل یوتھ پیلس ہے۔

ناشتے کے بعد پھر شینگ ہائی ریلوے سٹیشن پہنچے۔ آج ہم ایک اور خوبصورت شہر دسوچو، دیکھنے جا رہے تھے۔ ایک گھنٹے کا سفر ہے ریل کا اور دسوچو، ہانگچو کی سسٹر سٹی ہے۔ ۲۰۰۰ ہزار سالہ پرانی تاریخ اور اپنے خوبصورت مناظر کی بدولت ہانگچو کے بعد چین میں سوچو ہے۔ شینگ ہائی سے سوچو تک چار چھ بڑے اسٹیشن راہ میں آتے۔ تن شیا نگ این تنگ، کن شان اور باقی جو تھے۔ پڑھے نہیں جا سکے۔ دہقان عورتیں اور مرد ـــــ کھیت اور فصلیں، بانس کے جھنڈ، سبزیاں، ترکاریاں، آبادیاں، دریا، ندی، نالے اور اسٹیمرز ـــــ ہر شخص کسی نہ کسی کام میں مشغول گردو درگردہ بھی اور تنہا

اکیلا بھی۔

شینگ ہائی سے ہانگچو تک آتے جاتے سفر کے دوران مجھے اگر کوئی بچہ نہ کرتا دکھائی دیا تو تنہا گھومتا، کسی سوچ میں گم عم یا کھیلتا کودتا تو وہ آٹھ سات سال کے بچے تھے۔ مَیں نے جن کو مختلف بستیوں کے قریب کسی مکان کی منڈیر پر، صحن میں کھیلتے، گلی میں بھاگتے یا کسی ندی کنارے یا جوہڑ کے پاس سوچ میں گُم دیکھا اور اب سوچو جاتے ہوئے بھی کوئی اگر ایسا دکھائی دیتا ہے، تو کہیں کہیں اسی عمر کا کوئی بچہ ہے۔ اس عمر کے کچھ بچے عام بچوں سے اتنے مختلف ہوتے ہیں کہ تنہا اکیلے گھومتے ہیں۔ کچھ سوچتے پھرتے ہیں اور ان کی یہ عادت بھی ایک مصروفیت جیسا انہماک رکھتی ہے۔ چلتی گاڑی سے مَیں نے دیکھا وہ اپنے گھر کے پاس گھاس کے ایک قطعے پر گیند سے کھیل رہا تھا۔ گاڑی کی گڑگڑاہٹ سُن کر اس نے گیند اپنے پاؤں تلے داب کر رد کی اور گردن موڑ کر گاڑی کو دیکھنے لگا۔ پھر اُس نے ہاتھ لہرا لہرا کر خدا حافظ کہا۔ مَیں نے بھی جواب میں ہاتھ لہرایا۔ خدا حافظ خدا حافظ۔

کس کو خدا حافظ کہہ رہے ہو؟ خواجہ (مصوّر)

کامریڈ لِن نے پوچھا، اور مَیں نے بدستور باہر دیکھتے ہوتے کہا۔

اپنے بچے کو۔

یہ کیسے ممکن ہے۔ تمھارا بچہ چین میں کہاں؟

ہو سکتا ہے ہو سکتا ہے۔ مَیں نے کھڑکی سے سر نکالے پیچھے رہتے جاتے بچے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ اب پاکستان میں بھی نہیں ہے۔ دو سال پہلے کہیں چلا گیا تھا۔

کسی ریلوے سٹیشن پر گاڑی آہستہ ہو کر گزر رہی تھی۔ مَیں نے سٹیشن کا نام پڑھنا چاہا مگر حروف کی روشنائی پھیلی پھیلی سی تھی۔ تب مَیں نے انگوٹھے سے آنکھوں سے ڈھلکتے آنسو ہَوا کو سونپ دیئے خواب حقیقت بنتے کتنے خوش آئند ہوتے ہیں اور حقیقت خواب میں تحلیل ہوتی کس قدر کرب ناک۔ باقی کا سفر سوچونک کیسا تھا کس کو خبر ہے سمندر کے پار کی ؟

سوچو ریلوے سٹیشن پر گاڑی رُک گئی۔ ایک چھوٹا مگر خوب صورت ریلوے اسٹیشن۔ جہاں سے سیدھا ہمیں ٹائیگر ہل لے جایا گیا۔ جو چند منٹ کا فاصلہ تھا۔ یہ ایک تاریخی مقام ہے۔ جو ٹیلے پر واقع ہے۔ صدر دروازے کی محراب اور دائیں بائیں ایک جیسے دو روزن ٹائیگر کا منہ اور آنکھیں لگتی ہیں۔ محراب کے عقب مین آٹھ منزلہ ٹیل ٹائیگر کی دُم کی طرح کھڑا دکھائی دیتا ہے۔ یہی نقشہ اس پہاڑی کے نام کی وجہ تسمیہ ہے۔ محراب میں سے گزر کر داخل ہوں تو ایک طرف زمین پر ایک بڑی سِل دو لخت پڑی ہے۔ کہانی یوں بیان کی گئی کہ سورما جرنیل نے دیوہیکل تلوار کی دھار آزمانے کے لیے اس سِل پر ماری اور یہ درمیان سے کٹ گئی آگے بڑھیں تو پودوں کی تراشں خراش سے خوب صورت زیبائش کے نمونے نظر کو ذوقِ نظر دیتے ہیں۔ بادلوں جیسی چٹانیں جن کے دامن میں پھُولوں کی کیاریاں عجیب سماں باندھتی ہیں۔ چٹانوں میں پانی کا ایک قدرتی تالاب جس میں تین چار بڑے پتھر اُلٹے سیدھے پڑے ہیں۔ بتایا گیا کہ کسی واعظ کے وعظ سے یہ پتھر بھی سرنگوں ہو گئے تھے اور ایسی باتوں پر فوراً یقین کر لینا تو ہمارے بائیں ہاتھ کا کام

ہے۔ پھر پہاڑی کے اُوپر پہنچے جہاں لینگ ٹمپل ہے۔ جو آٹھ سال پُرانا ہے۔ ایک طرف آہستہ آہستہ جُھک رہا ہے۔ محکمہ آثارِ قدیمہ کی ہزار کوششوں سے اس ٹمپل کا جھکتے جانا رُک نہیں سکا۔ چینی محکمہ آثارِ قدیمہ بھی شاید پاکستانی محکمہ آثارِ قدیمہ جیسی خوبیوں کا مالک ہے۔ جو تاریخی عمارات کی کجی دُور کرتے کرتے قومی خزانے کی کمر خمیدہ کر دیتا ہے۔

یہ ٹمپل ہو خاندان نے اپنے عہدِ حکومت میں بنوایا تھا۔ اس پہاڑی سے سوچو کے مناظر دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اِس پہاڑی سے جو گی اُتر کر مشہور زمانہ چینی ایمبرائیڈری کی ایک فیکٹری میں پہنچے۔ چینی ہنرمندوں کی باریک کاری اور حسن و مہارتِ فن کے وہ نمونے دیکھے کہ ان کرشموں سے دامنِ دل خود بھی چھڑانے کو جی نہ چاہتا تھا۔ ہلکے ہلکے پیٹرن اور بیل بوٹوں والی ایمبرائیڈری سے کہیں آگے۔ نادر نمونہ ہائے مصوری کی ریشمی دھاگوں سے تخلیق تو ناقابلِ یقین حد تک معراجِ فن کو چھوتی ہے۔ چینی ہُنر مندوں کے انہماکِ فن کو سلام کرنے کے بعد ساڑھے بارہ بجے سوچو کے شاندار ہوٹل نین لن پہنچے اور کمرہ نمبر ۳۰۷ میں پہنچ کر ابھی گرم گرم پانی سے منہ دھو بھی نہ پاتے تھے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی کہ سوچو کے میئر کی طرف سے دیا جانے والا لنچ بالکل تیار ہے۔ بس ابھی آیا کہہ کر پھر منہ پر گرم گرم پانی ڈالا اور صاف کیا۔ اور کنگھی کرتے وقت اپنے بال کچھ زیادہ ہی سفید دکھائی دینے لگے۔ ان کا کوئی علاج شاید اہلِ چین کے پاس ہو؟

ان کا علاج اہلِ چین تو کیا اہل زمین نے اپنی ہزار کوششوں کے باوجود ابھی تک نہیں ڈھونڈ پایا۔

یہ میرے کان میں "جینے کی اہمیت" والے چینی دانشور لن یوتانگ نے

کہا۔ مجھے متوجہ پا کر اُس نے مزید کہا۔

اور اگر سفید بالوں کا کوئی علاج ہے ہی نہیں تو کیوں نہ انھیں خوبصورتی سمجھ لیا جائے۔

ٹھیک کہتے ہو کامریڈ۔ مَیں نے کہا اور لنچ کے لیے نیچے اُتر آیا۔ لنچ شروع ہوا۔ پہلا کورس ختم ہُوا۔ پھر دوسرا اور تیسرا علیٰ ہٰذالقیاس جوں جوں یہ سلسلہ دراز ہوتا گیا اپنی کوتاہیٔ فن کا احساس گہرا ہوتا گیا اور نوبت غنودگی سے بیہوشی تک پہنچنے لگی اور اگر جامِ صحت جلد تجویز نہ ہوتے ہوتے تو ہم شاید جانبر نہ ہو سکتے تھے۔ اُٹھے اور باہر ہوٹل کے لان میں گھومے پھرے اور یخ بستہ ہُوا سے برضا و رغبت دو چار تھپیڑے ہلکے سے کھائے تو ہوش قائم ہوئے۔

سہ پہر سانگ خاندان کے عہد کے ایک وزیر کا ذاتی باغ دیکھنے گئے۔ یہ باغ آٹھ سو سال پُرانا ہے اور اب قومی ملکیت ہے۔ اس باغ کی ایک گھنٹہ سیر کے بعد دوسرے باغ کی طرف چلے۔

سوچو کی سڑکوں پر بھی وہی درخت دو رویہ لگایا گیا ہے۔ جو شنگ ہائی اور ہانگچو کی سڑکوں کا حُسنِ نظر نواز ہے۔ مگر سوچو کی سڑکوں پر وہ بہار نہیں ہے۔ کہیں کہیں تو لاپروائی اور بے نیازی اس شہر کی سڑکوں سے روا رکھے جانے کا شدید احساس بھی ہوتا ہے۔

دوسرے باغ میں داخل ہُوئے۔ یہ منگ دورِ حکومت میں کسی نواب نے بنوایا تھا۔ اب یہ بھی قومی ملکیت ہے۔ اور تقریبًا چار سو سال پُرانا ہے اس باغ کے اندر ذوقِ تزئین و آرائش کی ایک اپنی اور کثیر دولت ہے۔ مگر لے آؤٹ ڈیزائننگ کے اعتبار سے اور طرزِ تعمیر کی مماثلت کے باعث

پہلے باغ کا مکمل تتبع ہے۔ ایک گھنٹہ سیر کے بعد آخر میں تیسرے باغ کو چلے، راستے میں شہر کے رہائشی مکانات کافی بے رنگ اور کسی حد تک بدصورت سے لگتے ہیں اور کہیں کہیں تو ہمارے بڑے شہروں کی کچی آبادیوں کا گمان گزرتا ہے۔

چین میں ہر شتے ذمیانے کے نظام نے کتنی ہی ناہمواریاں ہمواریوں میں بدل دی ہوں مگر اس کے جو منفی اثرات شہروں کے رہائشی حصّوں کی خوبصورتی پر پڑے ہیں۔ بے حد کھٹکتے ہیں۔ بے رنگ در و دیوار، خستہ حالت کھڑکیاں، شکستہ شیشے اور برائے نام کواڑ مکینوں کی ذاتی دلچسپی ختم ہو جانے کی نوحہ خواں ہیں۔

تیسرا باغ آگیا۔ یہ باغ دوسرے نمبر پر باغ کا ہم عمر ہے یعنی منگ دورِ حکومت کے ایک انسپکٹر جنرل پولیس نے بنوایا تھا۔ جس نے بے انتہا دولت رشوت میں کمائی اور بے حد خوب صورت جگہ اہلِ ذوق کے لیے چھوڑ گیا۔ یہ باغ پہلے دونوں باغوں سے ہر انداز میں جُدا ہے۔ پہلے دونوں گنجان باغ ہیں اور یہ کشادگی کا وافر احساسِ فرحت رکھتا ہے۔ اس طرح پہلے دونوں کی یہ باغِ تعبیرِ نو ہے۔ غالباً یہ استفادہ براہِ راست چین کی قدیم مصوری کی اُس تحریک سے کیا گیا ہے۔ جو دبے پاؤں منگ دَور میں چینی مصوری میں دَر آئی تھی جس میں تصویری گنجان پن کی جگہ مثبت خلاء Positive space کو شعوری اہمیت حاصل ہونے کا احساس واضح طور پر نظر آتا ہے اس طرح چینی مصوری ایک بے ساختہ پن سے ہمکنار ہوتی۔

شینگ ہائی کا باغ اور یہ تین سوچو کے باغ جن کو دیکھنے کا موقع ہمیں ملا۔ یہ باغات اس امر کی غمازی کرتے ہیں کہ چینی ذوقِ جمال موسیاتی

بوقلمونیوں سے ایک منفرد اور مخصوص انداز میں بہرہ مند ہوتا ہے۔ اِن باغات کا ایک ایک چپّہ ایک ایک گوشہ مصوّرانہ تخلیقی عمل کا مرہونِ احسان ہے۔ یوں لگتا باغات زمین پر تعمیر نہیں کیے گئے بلکہ پینٹ کیے گئے ہیں۔ اِن باغات کی ہر دیوار میورل، ہر گوشہ کمپوزیشن ہر آنگن سٹل لائف کا منظر پیش کرتا ہے۔ اِن باغات میں تصویری ذوق کو اتنی اہمیت سے پیشِ نظر رکھا گیا ہے کہ کوئی بھی دروازہ کھولیں کسی بھی روزن سے باہر دیکھیے۔ دروازے روزن اور روشندان کی چوکاٹھ تصویر کا چوبی فریم بن جاتا ہے اور نظر آنے والا منظر تصویر ہے جس میں چینی مصوری کی نوکیلی گرے اور براؤن رنگ کی چٹانیں نیلے پہاڑ پھولدار جھاڑیاں اور بانس کی لہلہاتی گہری سبز پتلی شاخیں جن پر ہلکے سبز پتے خوشی سے تالیاں بجاتے ہیں۔ اِس امر کا مزید ثبوت یہ ہے کہ ان باغات میں کمروں کی اندرونی تزئین و آرائش میں مصوّری اور خطاطی کے شہکار بہت قلیل تعداد میں ملتے ہیں۔ جیسے کہ مَیں نے اُوپر کہا ہے کہ یہ باغ جس کی ہم اب سیر کر رہے ہیں۔ پہلے باغات سے یکسر مختلف ہے۔ فطرت کے بے ساختہ پن سے اس باغ کا دامن بھرا ہوا ہے۔ سبز اور بھوری گھاس کے قطعات میں دیہی علاقوں کی پگڈنڈیاں ہیں اور کہیں کہیں دانستہ طور پر پودوں اور درختوں کی تنظیم اور ترتیب کو توڑ کر اکھڑا سا حسن پیدا کیا گیا ہے یہ باغ مختلف تختوں پر مشتمل ہے۔ چھوٹے چھوٹے تالاب اور پہاڑیاں ہیں۔ پُل ہیں۔ پیولین ہیں اور ہر پیولین کے گرد راہداری اور سیڑھیوں کی شکل میں روایتی چینی ڈریگن (اژدھا) کی فارم استعمال کی گئی ہے۔ اِس باغ میں خزاں، بہار، گرما، سرما، خشک اور تر موسموں کے حُسن سے لطف اندوز ہونے کے لیے الگ الگ تختے ہیں۔ یہاں بونے درختوں کا ایک کثیر ذخیرہ ہے

اور بونے درختوں اور پودوں کی عمریں ماشاء اللہ کئی کئی ہزار سال بتائی جاتی ہیں۔

رشوت میں بٹوری ہوئی دولت سے یہ جنت نگاہ بنوانے والے انسپکٹر جنرل پولیس کو جوتے بازی کا بھی از حد شوق تھا۔ جب اس کی جگہ کوئی اور رشوت لینے والا آ گیا تو موصوف کو جوتے کے چکر میں سزا ہوئی اس باغ کا کثیر حصہ بحقِ سرکار ضبط کر لیا گیا دوسرے رشوت خور نے ایسا کوئی باغ بنایا کہ نہیں البتہ اس راشی جوتے باز کا جنونِ باغ بانی نہ گیا اور اس نے ضبط شدہ باغ سے ملحق اپنی باقی ماندہ زمین پر بھی باغ بنوا لیا۔ پہلے دونوں حصوں میں دیوار تھی۔ مگر جب انقلاب باغ کی سیر کرتا اندر بھی آ گیا تو دیوار ہموار ہو گئی اور اب ہم دیوار پار حصے میں ہیں۔ انسپکٹر جنرل پولیس تھا یا جن تھا۔ اس کا ذوقِ جمال تھا کہ موسم بہار تھا۔ بوئے گل دیوار پھاند آئی اور بلبل کی زبان بھلا کبھی رکی ہے۔ عاجزی ہے تو بس دستِ صیاد اور کفِ گلچیں کے لیے ہے۔ قدم قدم پر وہ پولیس والا پھولوں کے گجرے دل کی ہتھکڑیاں لیے کھڑا ہے اور پاؤں میں شاخِ گل کی بیڑیاں ڈالتا ہے۔ آگے بڑھیں تو ایک ننھا سا پویلین ہے۔ جس کی شکل چینی دستی پنکھے کی ہے۔ اس پویلین کے روزن بھی پنکھے کی شکل کے۔ چھت بھی پنکھے کی شکل کی اور اس میں ایک لوح بھی پنکھے کی شکل والی نصب ہے۔ جس پر چینی خطاطی بے مثل اور مضمون لاجواب اس کا اس طرح ہے۔

"کون ہے جو ہمارے ساتھ یہاں بیٹھے اور یہ مناظر دیکھے"

ہم نے اس کی تنہائی پر ایک سرد آہ کھینچی جس نے بہ تکلف یہ اہتمام آج سے چار سو سال قبل یوں کیا کہ آج بھی پتے پتے سے بوئے وفا آتی ہے۔

ہم نے اس پیولین سے کچھ فاصلے پر ایک چائے خانے میں گرم گرم چائے ایک سحر میں گم ہو کر پی اور پھر سیدھے پہنچے سوچو ریلوے سٹیشن۔

گاڑی روانہ ہوئی۔ باہر اندھیرا اور اندر روشنی تھی، زندگی تھی۔ مگر اس پولیس والے کا عشق ابھی تک حواس کو اسیر کیے تھا۔ اندھیرے میں دیکھنے ڈھونڈنے اور کچھ محسوس کرنے کو جی چاہتا تھا۔

تراشیدہ زلفوں والی ویٹرس ننھی سی مگر آہو چشم اور سفید لباس میں تھی چائے لے آئی۔ ارباب نیاز نے اُس کا شکریہ زور دار قہقہہ لگانے کے بعد شے شے کہہ کر ادا کیا اور اپنی بیگم سے بولے۔

جیلاں پی لو۔ پی لو۔ بڑی اچھی چائے ہے۔

حبیب الرحمٰن نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں پر اپنی پتلی بھنویں سکیڑ کر آغا ناصر کی طرف دیکھا اور آغا ناصر نے میری طرف دیکھ کر آہو چشم کو دادِ حُسن دی۔ ؏

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ مَیں نے کہا۔ مگر ننھی سی اس کے واسطے تلوار چاہیئے۔ پھر مَیں نے آغا ناصر سے مشورہ کیا۔

یار آغا ہو سکتا ہے۔ مَیں چین کا سفر نامہ لکھوں تو کیوں نہ اس حسینہ سے عشق کر لوں۔ کون دیکھتا ہے اور پھر ہم بھی تو اس وطن میں اجنبی ہیں۔ ایک نہیں بلکہ کئی عشق کر دو تاڑ تاڑ تاکہ سفر نامہ میں گلیمر ہو۔ آغا ناصر نے مشورہ تو مجھے دیا مگر خود تحت اللفظ عشق کرنے لگا۔

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم
دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے

تیرے ہاتھوں کی شمعوں کی حسرت میں ہم
نیم تاریک راہوں میں مارے گئے
سولیوں پہ ہمارے لبوں سے پرے
تیرے ہونٹوں کی لالی لپکتی رہی
تیری آنکھوں کی مستی برستی رہی!
تیرے ہاتھوں کی چاندی چمکتی رہی
اپنا غم تھا گواہی ترے حسن کی،
دیکھ قائم رہے اس گواہی پہ ہم
لب پہ حرفِ غزل دل میں قندیلِ غم
ہم چلے آئے لاتے جہاں تک قدم

اور گاڑی شینگ ہائی ریلوے سٹیشن پر رُک گئی۔ مس تن اور دوسرے میزبان حضرات منتظر تھے۔ جنگ جیانگ پہنچے گھر کا احساس ہُوا مگر گھر نہ تھا۔ کھانا کھایا اور شینگ ہائی فرینڈشپ سٹور پہنچے۔ اس سٹور کے دو فلور ہیں۔ بہت بڑا ہے اور ہر شئے دستیاب ہے۔ ہر کوئی اپنی تلاش میں ایک دوسرے سے بچھڑ گیا۔ پردین کے لیے شینگ ہائی کا سلک خریدا۔ سعدیہ کے لیے گڑیا اور کھلونے، فہیم کے لیے قمیضیں اور ولید کے لیے سرما اور گرما کے لباس خریدے۔ ایک گھنٹہ بعد سب کو چینی میزبانوں نے ڈھونڈ نکالا اور ہانک کر وفد کی شیرازہ بندی کی اور واپس چلے شینگ ہائی شہر کی رات کی رونقیں دیکھیں۔ اتنا گنجان آباد اور زندگی کے ہنگاموں کا شہر ہے۔ پُرانے شینگ ہائی کی سڑکیں تنگ ہیں۔ جن پر الیکٹرک بسیں، کاریں، دیو ہیکل ٹرک، رکشا، ٹیکسی اور ان سے بڑھ کر سائیکلیں اور

فٹ پاتھ پر لوگوں کا ہجوم اور نوجوان جوڑوں کا اظہارِ محبت سرِعام مگر پھر بھی حیرت کی بات یہ کہ کوئی ایکسیڈنٹ نہ دیکھا۔ آج کی رات بہت بے چینی میں گزری۔ صبح جلدی آنکھ کھُل گئی اور گرم گرم پانی کے ٹب میں بہت دیر تک نہاتا رہا۔ پھر شیو کی لباس پہنا اور گرم گرم کافی کے بعد کھڑکی کھول کر شہر کا منظر دیکھنے لگا۔

(۱۹)

شینگ ہائی میں آج کڑاکے کی سردی ہے۔ چینی لوگ اپنے گھروں کے آنگن میں اور سڑکوں پر بس سٹاپوں پر کھڑے شیڈو باکسنگ کرتے دکھائی دیئے۔ یہ ایک ورزش ہے جو چینی لوگ زمانۂ قدیم سے کرنے کے عادی ہیں۔ یہ کھڑے کھڑے ہاتھ اور ٹانگوں کو سلوموشن فلم کے انداز میں چلاتے ہیں۔

آج پورا دن ہماری ڈسپوزل پر تھا۔ اور شام کو کینٹن کے لیے روانہ ہونا ہے۔ ناشتے پر آج خوب خوب باتیں ہوئیں۔

کینٹن میں کھانا ذرا دیکھ کر کھایئے گا۔ حبیب الرحمٰن نے سب کو متنبہ کیا۔

ارے کیا ہے زیادہ سے زیادہ ہمیں مینڈک کھانے کو دے دیا جائے گا۔ افضل قادر نے کہا۔

مینڈک۔ بیگم ارباب نیاز نے حیران ہو کر پوچھا۔

ہاں مینڈک یعنی ڈڈو۔ حبیب الرحمٰن نے ترجمہ کر دیا۔

کھالیں گے یار۔ آغا ناصر نے چیلنج قبول کر لیا۔

کُتے چوہے اور سانپ بھی بڑے پسند ہیں ان چینیوں کو۔ حبیب الرحمٰن

نے مینو اور پھیلا دیا۔ آغا ناصر کو للکارنے کے لیے۔
یہ توان کی ڈیلی کیسینر ہے۔ افضل قادر نے بتایا۔
افضل جو بہاری ہیں مگر انھوں نے پاکستان میں رہنا پسند کیا۔ بڑا نرم نرم چپ چاپ سا بندہ ہے۔
حبیب الرحمٰن فسٹ کلاس چینی بولتا ہے اور چینیوں کو خوب سمجھتا ہے کہنے لگا بس کچھ کھانے لگیں تو میرے اشارے کا انتظار ضرور کریں۔
آج شینگ ہائی میں شدید سردی ہے۔ سارا دن اوورکوٹ چڑھائے رکھے۔ پیدل گھومے، شاپنگ کی اور دوپہر کو پاکستانی کھانا مرغ کڑاہی کمہ کر بنوایا اور مزے اُڑائے۔ سہ پہر میں بھی مٹرگشت کی۔ شام ساڑھے چھ بجے جنگ جیانگ سے نکلے اور شینگ ہائی ائرپورٹ پر پہنچ گئے۔ شینگ ہائی کے چار ائرپورٹ ہیں۔ دو سول اور دو فوجی ہیں۔ ہنگ پیاؤ انٹرنیشنل ائرپورٹ ہے۔ جہاں سے ہم کینٹن روانہ ہو رہے ہیں۔ ہلکی ہلکی بارش ہے سات بجے طیارہ فضا میں بلند ہوگیا۔ ہم نے کھڑکی سے شینگ ہائی کی روشنیاں دیکھیں۔ چین کا عظیم شہر جو تقریباً ۸۰۰۱ مربع کلومیٹر پر پھیلا ہوا ہے، اور جس کی آبادی تقریباً ۱۲٫۶۸ ملین ہے۔ شینگ ہائی دریائے وانگ پو کے کنارے پر اور ینگسی سے ۱۲ میل کے فاصلے پر آباد ہے۔ مغربی اقوام کے زیرِ نگیں رہنے سے شہر کی تعمیر کا طرز بیشتر مغربی ہے۔ شینگ ہائی صنعت کا مرکز ہے اور مصروف تجارتی بندرگاہ ہے۔ عصرِ حاضر سے خراج وصول کرنے والا ماضیِ مرحوم کا مظلوم شہر شینگ ہائی ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا تھا قمار خانہ
دو گھنٹے کی پرواز تھی۔ رات کی وجہ سے باہر کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اِس

لیے سب اپنے اپنے ساتھ والوں سے محوِ گفتگو ہیں۔ چینی ائر ہوسٹس نیوی بلیو ماؤ کیپ، جیکٹ، پینٹ اور گلے میں پیلا سکارف لگائے اِدھر سے اُدھر گھوم رہی ہیں۔ چین میں مرد اور عورت کے لباس میں کوئی فرق نہیں۔ البتہ تفریح گاہوں پر عورتیں امتیازی لباس پہنے دکھائی دیتی ہیں۔ وگرنہ عورت اور مرد کا فرق بادی النظر میں مشکل ہوتا ہے۔ تاوقتیکہ کوئی دراز گیسوؤں والی نے دو چٹیا شانوں پر گرا رکھی ہوں۔ ہوٹلوں میں ویٹرس کا لباس یہی مگر رنگ سفید ہوتا ہے اور انتخاب بڑا کڑا ہوتا ہے اور ائر ہوسٹس کے سلسلے میں تو چینی لاکھوں چھوڑ کروڑوں میں ایک تلاش کرتے ہیں اور اِس سلسلے میں چینی گوہر شناس پی آئی اے سے بہت متاثر ہے اور اس امر کا اظہار اکثر سرکاری تقریبات میں انھوں نے کھُلے دل سے کیا۔ نیوی بلیو رنگ کے لباس میں پیلا سکارف لگا کر سفید سُرخ رنگت اور نکھر جاتی ہے اور خصوصًا رات کی پروازوں میں جب باہر کچھ دکھائی نہیں دیتا تو اندر بھی ان نیلی پوشاک والیوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ گفتگو کسی سے ہو ترا دھیان رہتا ہے اور اسی وجہ سے ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے سلسلۂ تکلم کا۔ اگر وہ مہربان ہوں اور جہاز کی طرف سے کوئی سووینئر وغیرہ پیش کریں تو طرزِ نوازش سوا فسانے گھڑنے کی ترغیب دیتی ہے اور اُردو کے بیشتر سفر نامہ لکھنے والے خوب یاد آتے ہیں۔ اُس نے جب ہمیں ہاتھی دانت کی کنگھی پیش کی تو امجد اسلام امجد مجھے اس قدر یاد آیا جس قدر میرے سر پر بال ہیں۔

اس پرواز میں کامریڈ لِن سے مَیں نے بہت ساری باتیں پوچھیں جن کا جواب اور جس طرح دیا۔ یوں ہیں۔ چینیوں کی اوّل ترجیح بائیسکل ہے۔

نمبر دو سلائی مشین نمبر تین استری اور کسی کی عمر بہت ہی طویل ہو اور وہ قطرہ قطرہ جمع کر کے دولت کا دریا جمع کر لے تو ٹرانسسٹر خرید لیتا ہے۔ اور دولت کا دریا دریائے ینگسی جیسا لمبا ہو تو ٹی وی پر مورتیں بھی دیکھی جاتی ہیں۔ محلہ کمیٹیاں نہانے کے آٹھ ٹوکن ایک شخص کو ماہانہ دیتی ہیں۔ کوئی ایک ہی دن میں آٹھ بار نہا لے یا ضرورت پڑنے پر نہا لے۔ اب حکومت محدود جائیداد کی بھی چھوٹ دے رہی ہے۔ مثلاً چھوٹا سا مکان اور دہقان کو مختصر قطعۂ اراضی جس کی پیداوار کا سرکاری حصّہ نکال کر باقی دہقان کا ہوتا ہے۔

دوسری ائر ہوسٹس آئی اور کی رنگ دے گئی۔ لہٰذا گفتگو کا سلسلہ جو ائر ہوسٹس کے آنے سے ٹوٹا تھا پھر وہیں سے جوڑنے کی کوشش کی تو دوسری ائر ہوسٹس نے کینٹن میں خوشگوار موسم کی نوید سنائی اور بتایا کہ چند لمحوں میں لینڈنگ ہونے والی ہے اور اُمّید کی کہ ہمارا سفر اچھا گزرا ہو گا۔ جو یقیناً بہت اچھا نہ تھا۔ پس ہم کینٹن ائرپورٹ پر اُتر گئے۔ روشنی میں نہایا ہوا خوشنما ائرپورٹ ہے۔ ہلکی ہلکی بارش کی پھوار پڑ رہی ہے۔ لیکن خوشگواری کا احساس واقعی وافر ہے۔ لہٰذا ہوٹل پہنچ کر سب سے پہلے کوٹ اُتاریں گے۔ ائرپورٹ سے نکلے تو رات کی وجہ سے مناظر صاف نہیں ہیں۔ پھر بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ سڑک کے دونوں جانب سفیدے کے تناور درخت اور اُن کے پیچھے کھیت ہیں۔ تقریباً پندرہ منٹ میں ہم کینٹن کے ایک عالیشان ہوٹل تن فینگ Tun Fang میں اُترے بہت بڑا لاؤنج عبور کر کے کمرہ نمبر ۲۵۰۹ چوتھے فلور پر ملا۔ جس میں داخل ہو کر سب سے پہلے کوٹ اُتار دیا۔ پیچھے ہی پیچھے ویٹرس چلی۔ جس نے

گرم گرم بھاپ اڑاتا مہک برساتا تولیہ منہ ہاتھ صاف کرنے کے لیے دیا۔ ہاتھ منہ صاف کیا۔ پھر سب نے مل کر کھانا کھایا اور چائے پی۔ اپنے وطن کی طرح کالی چائے چینی دودھ والی۔

تن فینگ ہوٹل بھی ایک شہر اپنے دامن میں رکھتا ہے۔ بہت سی گوناگوں دلچسپیوں کا گہوارہ ہے۔ ہانگ کانگ اور کینٹن ایک دوسرے سے قریب ہیں اور آنے جانے کی آزادی کی بدولت تن فینگ ہوٹل میں قربت کی ساری نعمتیں خوب خوب دکھائی دیتی ہیں۔ بھانت بھانت کے لوگ اور ملک ملک کے تماشبین تماشہ دیکھتے تماشہ بنتے نظر آتے ہیں۔ رات بہت ہوگئی تھی۔ اِس لیے کمرے میں پہنچے اور سو گئے۔

巴中友谊万岁

۲۳ر نومبر کی صبح ناشتے میں کالی چائے دودھ چینی والی پاکر سب کے چہروں پر ایک نور اُتر آیا تھا اور سب نے کم از کم تین تین کپ پیے۔ ساڑھے آٹھ بجے ہاتھی دانت کی آرائشی مصنوعات بنانے والی ایک فیکٹری دیکھنے گئے۔ اس کارخانے کے کئی شعبے ہیں۔ ایک ایک کر کے سب دیکھے۔ ایک ایک کاریگر اپنے فن میں ماہر اور اپنا فریضۂ فن جس خلوص اور محنت سے سرانجام دے رہا تھا۔ لائقِ ستائش ہے۔ شعبۂ خطاطی کے انچارج خطاط نے ایک مجھے اور ایک اربابِ نیاز کو خطاطی کر کے تحفہ میں دے دی۔ ہم نے وزیٹرز بک میں دستخط کیے۔ مَیں نے پاک چین دوستی کا ایک طغرہ بنا کر فیکٹری کے کارکنوں کے نام منسوب کیا۔ یہاں سے نکل کر کینٹن ہسٹری میوزیم پہنچے۔ یہ ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ اس تک پہنچنے کا راستہ بہت خوب صورت ہے اور مری کی سڑکوں سے ملتا جُلتا ہے کینٹن کا موسم گرم ہے۔ مگر بارش سے ہلکی ہلکی خنکی فضا میں موجود ہے۔ میوزیم کے چار فلور ہیں۔ ایک گھنٹہ سیر کی اور چوتھے فلور کی بالکنی میں چائے پیتے ہوئے کینٹن کا نظارہ کیا۔ سامنے کی پہاڑی پر چینی تاریخ کے

ایک ہیرو کی یادگار دکھائی دیتی ہے ۔اسی پہاڑی کے دامن میں اس سورما کی یاد میں پویلین ہے۔ میوزیم کے سامنے نشیب میں کینٹن کا سپورٹس میوزیم ہے ۔

میوزیم کی چوتھی منزل سے نیچے اُترے اور واپس جاتے ہوئے کینٹن کے مرکزی پارک گوانگ یوآن میں پھُولوں کی نمائش دیکھتے ہُوئے ہوٹل پہنچے۔ اپنے کمرے کی مشرقی کھڑکی کا پردہ سرکا کر بلند و بالا عمارات کے دامن میں جھونپڑیوں جیسے مکانات کی آبادی بھی دیکھی۔ کینٹن جس کا چینی نام کوانگ چو ہے۔ کبھی فصیل بند تھا اور آٹھ دروازے تھے۔ اب دروازے باقی ہیں۔ فصیل معدوم ہو چکی ہے۔ جدید کینٹن انگریز بہادر کا بنایا ہوا ہے اور ہانگ کانگ کا برادرِ خورد ہے۔ فارسی محاورے سگ باش برادرِ خورد نہ باش سے اللہ کی پناہ مانگی کہ یہاں لوگ دُور دُور سے کُتے کھانے آتے ہیں۔ لنچ کے بعد کینٹن فرینڈ شپ سٹور میں شاپنگ کے بعد چینی بھائی کہیں اور لے جانا چاہتے تھے مگر ہم مُصر تھے کہ اس شہر میں ہمارے آقا و مولاؐ کے ایک صحابیؓ کا مزار ہو اور ہم حاضری نہ دیں ۔ یہ گستاخی ہے اور ہم بے ادب نہیں ہیں ۔ چینی ہماری خواہش کے احترام میں ہمیں وہاں لے گئے ۔ گوانگ یوآن پارک جہاں پہلے پہر ہم نے پھُولوں کی نمائش دیکھی تھی ۔ اس کے صدر دروازے کے بالمقابل سڑک پار بانس کا ایک سرسبز و شاداب ذخیرہ دکھائی دیتا ہے اور ساتھ ہی ایک قدرے چھوٹی سڑک اندر جاتی ہے ۔جس پر ہماری گاڑیاں مُڑ گئیں اور تقریباً فرلانگ اندر جا کر رُک گئیں اور ہم سب پیدل اِس سڑک سے بائیں ہاتھ نکلتی ایک پگڈنڈی پر بانس کے ذخیرے میں چلنے لگے ۔ایک

فرلانگ کے فاصلے پر ایک سفید دیوار میں چینی طرز کا دروازہ ہے جس پر روضہ ابی وقاص رضؓ لکھا ہے۔ اردو اور چینی میں۔ ہم اندر داخل ہوئے تو دو چینی سر پر کپڑے کی ٹوپیاں پہنے استقبال کو بڑھے۔ ہاتھ ملائے اور میں نے ہاتھ سے اوک بنا کر منہ میں پانی ڈالنے اور انگلی چلا کر پانی اُگلنے کا اشارہ کیا تو وہ فوراً میرا اشارہ سمجھ کر مجھے وضوگاہ پر لے گئے۔ باقاعدہ ہمارے ہاں جیسی ٹوٹیوں والی وضوگاہ ہے۔ مَیں نے کلی کی۔ اور بتایا گیا کہ جہاں ہم کھڑے تھے مسجد ہے اور تیرہ سو سال پُرانی ہے۔ مسجد کی مغربی دیوار میں پھر ایک دروازہ ہے۔ جس پر اردو اور چینی میں روضہ ابی وقاص رضؓ لکھا ہے۔ دروازے سے گزر کر پندرہ بیس گز کے فاصلے پر مزار ہے۔ حاضر ہوئے فاتحہ پڑھی قبر زمین سے تقریباً چار فٹ بلند ہے۔ اور مختلف رنگوں کی ریشمی چادریں چڑھی ہوئی ہیں۔ فرش پر قالین ہے۔ قبر والے کمرے کے اردگرد قبرستان ہے۔ کچھ قبریں پختہ کچھ کچی ہیں۔ پام کے پودے عام ہیں۔ مسجد میں واپس آئے۔ جہاں چند لمحے رُکے۔ یہاں سب لوگوں نے عجیب طرح کی تازگی محسوس کی اور ارباب نیاز نے کہا۔

یارا یہاں آکر تو طبیعت تازہ ہو گئی ہے۔

یہ دیکھ کر ازحد مسرت ہوئی کہ یہ روضہ اور مسجد نہایت عمدہ طریقے سے رکھی گئی ہے۔ اور نیشنل مونومنٹ ڈیکلر ہو چکی ہے۔ چین کے تقریباً ہر حصّے میں مسلمان ہیں اور مساجد بھی ہیں مگر چینی مسلمانوں کی اکثریت صوبہ سنکیانگ میں ہے۔ چینی مسلمانوں کی مشہور قومیں اوئی گر، قازق، منگول، تاتار اور کرغیز وغیرہ ہیں اور یہ سب سر پر ایک مخصوص وضع کی ٹوپی رکھتے ہیں۔ جن دو چینیوں نے ہمارا استقبال کیا وہ بھی مسلمان تھے۔ اُن سے مختصر حال

چال پوچھنے تک ہی بات ہو سکی ۔ باہر آئے تو راستے میں آتی جاتی چینی عورتیں اور بچے السلام علیکم کہہ کر گزرتے۔

رات کو کینٹن کے نائب گورنر نے ایک روایتی مگر خوش نما اور بھول بھلیوں والے ریستوران میں عشائیہ دیا۔ ہم سب کوئی بھی ڈش چھیڑنے سے پہلے حبیب الرحمٰن کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتے اور اشارہ پا کر کھانا شروع کرتے یا گریز کی حالت میں اورنج جوس پینے لگتے ۔ ہماری احتیاط کی وجہ سے کھانا اتنا زیادہ تھا کہ بعض چینی میزبان تو کھا کر فی الواقع بے ہوش ہونے کے قریب پہنچ کر بہانہ کر کے محفل سے اُٹھ گئے ۔ واپس تن فینگ آئے اور گھوم پھر کر طبیعت ہلکی کرنے لگے۔

ارباب نیاز نے ایک جگہ مجھے ایک پوسٹر کی طرف اشارہ کیا لکھا تھا کہ کامریڈ فلاں فلاں دن فنگر کیلی گرافی اور فنگر پینٹنگ کا مظاہرہ کریں گے اس پوسٹر کے سپانسرز ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی کہ پانچ دن بعد کیا کل یہ مظاہرہ کر دیتے ہیں ۔ مگر سپانسرز تو نہ ملے ۔ البتہ مظاہرہ کرنے والے کامریڈ فلاں مل گئے ۔ اُن سے کیلی گرافی اور پینٹنگ پر بڑی دیر تک باتیں کیں اور اس بات چیت میں حبیب الرحمٰن مترجم کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔

۲۱
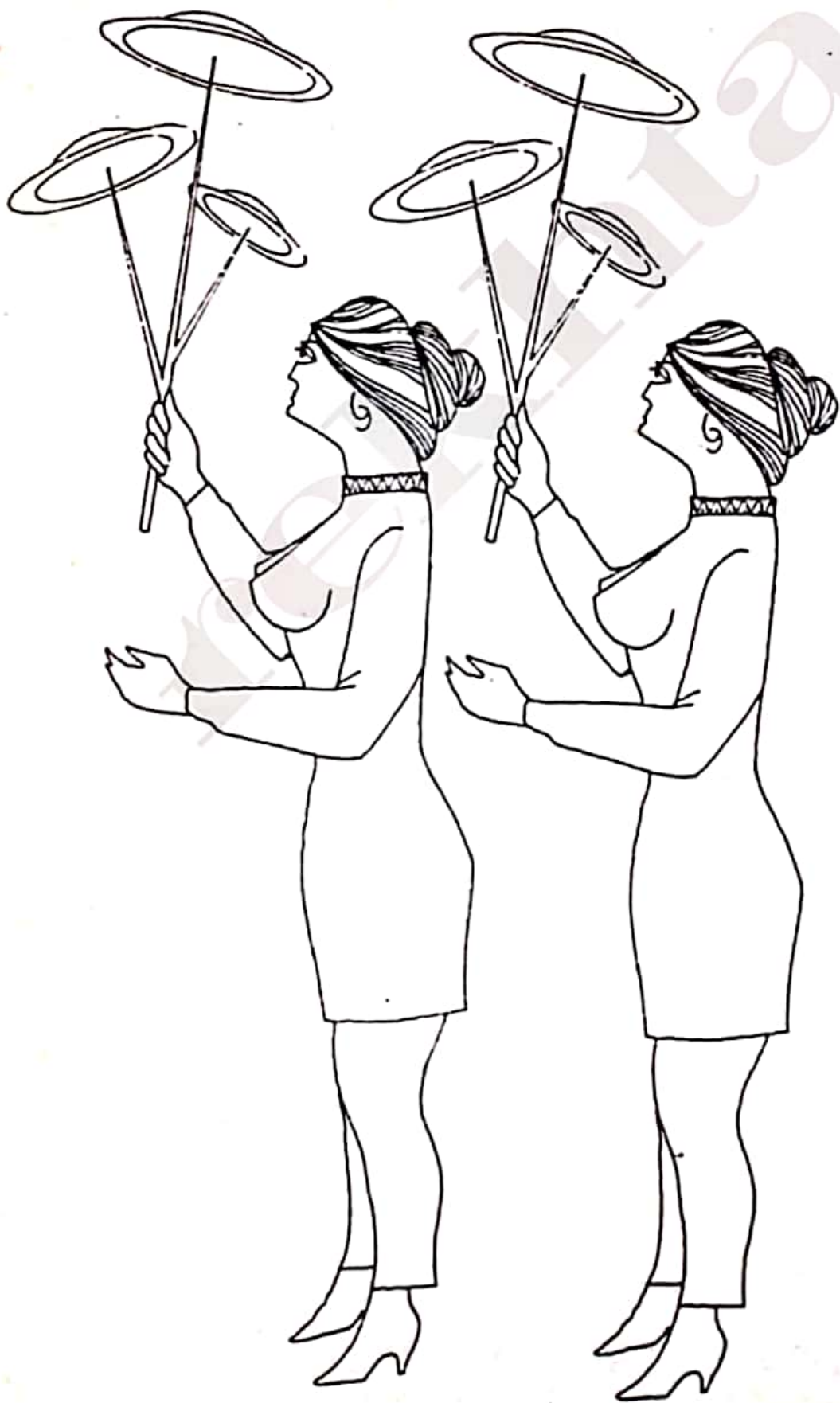
۲۴ر نومبر کی صبح ناشتہ کر کے کینٹن ائرپورٹ پہنچے ارباب نیاز، بیگم ارباب نیاز اور آغا ناصر دورہ ختم کر کے ہانگ کانگ روانہ ہو رہے تھے۔ مجھے ابھی واپس بیجنگ جانا تھا۔ انھیں خدا حافظ کہا۔ واپس ہوٹل آکر پھر کینٹن فرینڈ شپ سٹور پہنچے۔ یوآن خرچ کیے اور واپس ہوٹل آکر دوپہر کا کھانا کھایا اور کمروں میں بند ہو کر سستانے لگے۔

شام چار بجے مشہور چینی مصوّر کا مریڈ لین ژیون بمع اپنی مصوّر بیوی کے اور بہت ساری نئی تخلیقات کا بنڈل اُٹھائے ملنے آئے۔ لین ژیون پاکستان کا دورہ بھی کر چکا ہے۔ اُس کا تازہ کام دیکھا۔ پورٹریٹ میں خاص دلچسپی رکھتا ہے۔ اور یورپی اثرات سے مستفید ہو رہا ہے۔ ہم نے اُس کی خاطر چائے اور بسکٹ سے کی۔

شام کے قریب مَیں نے اور حبیب الرحمٰن نے کینٹن شہر میں آوارہ گردی کی۔ لطیفے سُناتے اور سُنتے۔ ہانگ کانگ سے یوآن کمانے آئی ہوئی لڑکیوں کا پیچھا کرتے جاپانی دیکھے۔ ہمارے ہاں کی تکے کباب کی دوکان کے مشابہ ایک دوکان کے سامنے لوگوں کا ہجوم دیکھا جو ہونٹوں پر زبانیں پھیرتے

تھے اور للچاتی ہوئی نگاہوں سے اندر دیکھتے تھے۔ حبیب الرحمٰن سے پتہ کرنے کو کہا۔ وہ آگے بڑھا۔ پوچھا اور آکر مجھے بتایا کہ نہایت لذیذ گوشت ہے سٹیم روسٹ کیا ہُوا۔ دوکان دار کامریڈ کہتا ہے۔ ایک بار کھاؤ گے تو پھر کھانے ضرور آؤ گے۔ ہم نے آگے بڑھ کر شوکیس میں دیکھا۔ بُھنے ہوئے پلے بھی اور خونخوار سائز کے کتے بھی مع پائنچوں، کانوں اور دموں کے سٹیم روسٹ کیے ہوئے لٹک رہے تھے۔

شام کے کھانے کے بعد حبیب الرحمٰن نے ایک پاکستانی طالب علم کو بُلایا اور میرے ساتھ وقت گزارنے کا کہا۔ کیونکہ وہ خود اب دوسرے انتظامی اُمور میں مصروف ہونا چاہتا تھا اور مَیں کامریڈ شان کامریڈلِن اور مادام چنگ سے ذرا علیحدہ ماحول میں کینٹن کی سیر کرنا چاہتا تھا۔ طالب علم کا نام سعید ہے اور تین سال سے کینٹن میں زیرِ تعلیم ہے۔ بہت اچھی چینی زبان سیکھ چکا ہے۔ شیخی بگھارنے میں بڑا ماہر لگتا تھا۔ لیکن چین جیسے عملی ملک میں شیخی بگھارنے والے حضرات سے خواہ مخواہ چڑ سی ہونے لگتی ہے۔ مگر اُس سے پسندیدگی کا ایک رشتہ بھی مستحکم تھا کہ اُردو بھی بہت اچھی بولتا تھا۔ اس طرح کامریڈ شان کی اُردوئے معلےٰ سے نجات مل گئی۔

تن فنگ ہوٹل کے سامنے سرکس ہاؤس کے گیٹ پر بڑی رونق تھی۔ کینٹن میں لباس کے بارے میں باقی شہروں والی باقاعدگی نہیں ہے۔ اور عورتیں تو اس قید سے بالکل آزاد لگتی ہیں۔ نیلے پیلے سفید کالے سبز گرے تمام ہی رنگوں کے سوئیٹر جرسیاں کوٹ پتلون، سکرٹ بلاوز پہنے عورتیں ہر عمر اور ہر سائز کی عورتیں سرکس ہاؤس کے گیٹ پر گھوم پھر رہی

تھیں۔ مَیں نے سعید سے کہا کہ تن فینگ سٹور سے کاجو کے ایک دو پکیٹ لے آئے تاکہ ذرا منہ چلتا رہے۔ بصورتِ دیگر ذہن چلنے گا گویا شیطان کا کارخانہ چلے گا۔ سعید کاجو مونگ پھلی لینے گیا اور مَیں سگریٹ سلگا کر سڑک کنارے کھڑا ہو کر تماشہ دیکھنے لگا۔ میرے قریب دو سائیکل سوار نوجوان لڑکی اور لڑکا نیچے اُترے سائیکلیں کھڑی کیں۔ پھر لڑکی جنگلے پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی اور لڑکا اس کے ساتھ لگ کر باہیں اس کی کمر میں ڈال کر اس کی بلائیں لینے لگا اور مَیں دوسری طرف دیکھنے لگا۔ سامنے سے سعید آتا دکھائی دیا کاجو کے پیکٹ ہاتھ میں اور دو لڑکیاں اپنے آزو بازو میں۔ ایک لمبی ہے۔ پتلی ہے۔ سفید پینٹ نیلی جرسی اور سر پر پیلا سکارف اور دوسری درمیانی قامت کی جنیز میں کسی ہوئی اور بالوں کی دو چٹیا شانوں سے گرائے ہوئے تھی۔

ان سے ملیے بڑی اچھی لڑکیاں ہیں۔ یہ جنیز والی ہانگ کانگ سے کینٹن آئی ہے اور یہ یہیں کی حسینہ ہے۔ دونوں کا اصرار ہے کہ پہلے ان کے ساتھ سرکس ہاؤس میں ڈانس کریں پھر ہم لوگ جہاں پسند کریں گے یہ ہمارے ساتھ کھانا کھانے جائیں گی۔

سعید اچھا کیا تم نے ایک ہی سانس میں سب کچھ بتا دیا۔ مَیں تو کھانا کھا چکا اور ڈانس مجھے آتا نہیں۔ ان کو چھٹی دے دو مَیں اُن کے لیے بیکار ہوں۔

چلو ویسے ہی پھرتے ہیں ان کے ساتھ کمال صاحب۔

لیکن ان کا قیمتی وقت ضائع کرنے سے ہمیں کیا حاصل ہو گا۔ ہم ان کے بغیر گھومیں گے تم ان سے کہہ دو کہ یہ کسی اور کے ساتھ گھومیں پھریں۔

سعید میاں انھیں چلتا کرو۔

اور سعید سرکس ہاؤس کے گیٹ پرلے جا کر انھیں چھوڑ کر آ رہا تھا کہ سڑک عبور کرتی آتی ایک عورت جس نے ٹوکری اُٹھا رکھی تھی ایک ہاتھ میں اور دوسرے میں ایک پپیتا پکڑ رکھا تھا۔

میرے سامنے آکر بولی۔ ہیلو۔

مجھے خاموش دیکھ کر وہ پھر بولی ہیلو۔

ہیلو مَیں نے بھی جواب میں کہہ دیا اور ہم دونوں ایک دوسرے کو تکنے لگے۔ کیونکہ میری چینی دانی ختم تھی اور اُس کی انگریزی دانی میں بھی دوسرا کوئی لفظ نہ تھا۔ سعید آگیا تو مَیں نے اُسے آگے کر دیا۔ وہ چند لمحے باتیں کرنے کے بعد مجھے بتانے لگا۔

کہتی ہے کہ یہ جو اُس کے ہاتھ میں پپیتا ہے۔ تحفے میں دے گی۔ اگر مَیں اپنی کرنسی اس کی کرنسی سے بدل لوں۔ کیوں کہ باہر سے آنے والوں کو دی گئی کرنسی کھُلے بازار میں اور مقامی لوگوں کی کرنسی فرینڈشپ سٹور میں قبول نہیں کی جاتی اور فرینڈشپ سٹور سے یہ بی بی کچھ اپنی پسند کی چیز خرید کرنا چاہتی ہے اور اگر آپ ایسا کریں گے تو وہ پھر آپ کو اظہارِ تشکر کے لیے اور کسی جگہ چلنے کی دعوت دے گی۔

اسے بھیجو یار —— خواہ مخواہ پریشانی ہوگی۔ مَیں نے سعید سے قدرے بیزاری سے کہا۔ اور اتنے میں ایک نہایت خوبصورت لڑکی نیلی پینٹ پر سفید ہائی نک پہنے اور بالوں میں ربن لگائے بس سے اُتری اور ہمارے قریب ایک درخت کے نیچے رُک کر اِدھر اُدھر متلاشی آنکھوں سے دیکھنے لگی۔

کیا خوب صورت شئے ہے۔ مَیں نے سعید کی جانب دیکھ کر بے ساختہ داد دی۔

واقعی یار بہت عمدہ — لو ابھی پتہ کرتا ہوں ۔ سعید نے کہا اور لپک کر اُس کے سامنے جا کھڑا ہُوا۔ چند لمحے گفتگو کرنے کے بعد لوٹا تو بتایا کہ وہ منتظر ہے کسی کی ۔ ورنہ اُسے کوئی اعتراض نہیں چلو دیکھتے ہیں تھوڑی دیر اگر اُس کا انتظار ختم نہ ہوا تو پھر ہم تو حاضر ہیں ، کیوں ؟

سعید تم یہاں خوب رچ بس گئے ہو اور خوب پہچانتے بھی ہو اور بات بنا لینے کا ڈھنگ بھی جانتے ہو مگر یہ جو میرے پاس بلٹر یا سا کھڑا ہے تمھاری حرکات بڑے غور سے دیکھ رہا ہے ۔کیونکہ تم لپک کر جاتے ہو لڑکی کی طرف اور پھدک کر آتے ہو میرے پاس کہیں کوئی مصیبت نہ کھڑی ہو جاتے ۔

سعید نے اُس بلٹر یا نما آدمی کو غور سے دیکھا اور فکر مند ہو کر بولا ۔ یار کہیں سی آئی ڈی کا آدمی نہ ہو ۔ ٹھہرو میں اِس سے بھی بات کر دیکھوں ۔ پھر سعید اُس بلٹر یا سے بھی بات کرنے لگا اور کرتا چلا گیا ۔ پھر کہیں لوٹا تو قہقہہ لگاتے ہوئے بولا ۔

جاپانی ہے سالا ۔ گلے تک شراب سے لبریز ہے اور چھوکری کی تلاش میں ہانگ کانگ سے آیا ہے ۔

ارے ٹھہریں یہ بھی ہو جائے اور ایک میک اپ زدہ موٹی ٹھنگنی سکرٹ اور جرسی میں ملبوث عورت کی طرف لپک کر گیا اور اپنے کولہوں پر ہاتھ ٹکا کر اُس سے اِس بھیڑ میں یوں باتیں کرنے لگا جیسے وہ سیدھی اسی کی تلاش میں آئی تھی ۔

ایک لڑکی اور لڑکا تیزی سے سڑک پار کر کے آئے اور فٹ پاتھ سے اُتر کر ذرا اندھیرے میں ایک دوسرے سے بغل گیر ہو کر پتھرا گئے ۔

سعید آیا اور کہنے لگا کہ یہ خاتون انگریزی بھی بول سکتی ہے ۔ہانگ کانگ

سے آتی ہے۔

سعید یار تم نے مجھے کینٹن کی سیر کروائی تھی اور ہم ایک گھنٹہ سے اسی سرکس ہاؤس کے سامنے کھڑے ہیں۔ مَیں تمھارا بہت مشکور ہوں۔ مَیں تھک چکا ہوں۔ اب جا کے آرام کرتا ہوں۔ شکریہ! خدا حافظ۔

سعید چلا گیا اور مَیں ہوٹل میں آ گیا۔ تن فینگ کے وسیع لاؤنج میں چینی خطّاطی اور مصوّری کے شاہکار دیکھنے لگا۔ مگر ہر شے بے رس سی ہو گئی تھی۔ ہوٹل کی بار میں گیا۔ لڑکیاں، لڑکے، بچے، جوان، بوڑھے اور کھوسٹ میمیں بڑی رونقیں لگائے ہوتے تھے۔ کبھی کبھی رونق بھی ناقابلِ تعریف ناقابلِ فہم سی بجھارت بن جاتی ہے۔ آگے آگے چلتی ہے۔ پھر غائب ہو جاتی ہے۔ دل میں رونق ہوتی ہے یا آنکھ میں یہ دماغ میں ہوتی ہے یا دھیان میں رہتی ہے یا کہ گیان میں؟ کیوں بعض اوقات انسان رونق کی تلاش میں اپنے دل اور آنکھ اپنے دماغ اور رُوح کے خانوں میں بھٹکتا ہے۔ دھیان کی دیواروں سے سر ٹپکتا ہے۔ مگر گیان کا دروازہ نہیں کھُلتا۔ رونق ہاتھ نہیں آتی۔ رونق ساتھ ساتھ چلتے ہُوئے یک دم کیوں دبے پاؤں کہیں اپنا راستہ جُدا کر لیتی ہے۔

مَیں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ فریج سے جُوس نکال کر پیا اور بیڈ پر لیٹ کر اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیے۔ مگر طبیعت میں بے چینی ہے۔ سارے بدن میں نامعلوم سی چبھن کا احساس تیز ہوتا جا رہا ہے۔ مَیں کمرے سے نکل آیا۔ ہوٹل سے نکل کر بائیں مُڑ گیا۔ دو فرلانگ چلنے کے بعد ایک چوک سے دائیں جانب ہو لیا۔ اکیلا۔ اجنبی۔ زبان سے ناآشنا۔ راہ سے ناواقف۔ لیکن مَیں تلاش کر لوں گا۔ کہیں بھی۔ کچھ جذبوں کی ایک ہی زبان

ہوتی ہے۔ جو سب جانتے ہیں۔ سب سمجھتے ہیں۔

مَیں چلتا جا رہا ہوں۔ سڑک پر اب آمد و رفت خاصی کم ہو چکی ہے۔ جہاں کہیں اندھیرے گوشے ہیں۔ جوان دلوں جوان جسموں نے وہاں چراغِ وفا روشن کیا ہُوا ہے۔ تقریباً ایک میل چلنے کے بعد پھر ایک راؤنڈ اباؤٹ آ گیا اور مَیں اندازے سے ہوٹل کی جانب میں جاتی ہوئی ایک اور سڑک پر بائیں ہاتھ مُڑ گیا۔ لمبے لمبے تناور سفیدے کے درخت جن سے کہیں کہیں ٹیک لگائے جوان جسم ایک دوسرے میں پیوست ہیں۔ پھر کسی نے میرے کان میں کہا ادھر بائیں گھوم جاؤ یہ ہے بانس کی خوشبو والا علاقہ بڑھ جاؤ آگے اندھیرے میں داخل ہو کر گم ہو جاؤ تمھیں کوئی نہیں دیکھے گا۔ یہ جو اندیشے تمھارے دل میں جاگتے ہیں۔ فضول ہیں۔ پاسپورٹ نہیں ہے کوئی بات نہیں۔ زبان نہیں آتی نہ سہی، بولنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ اس پگڈنڈی پر ہو ہو لو یہی راستہ ہے۔ وہ ہے سفید دیوار۔ دروازہ بند ہے تو کیا ہوا۔ دروازہ کھٹکھٹاؤ۔ چلو چھوڑو دروازہ بند ہے تو کیا یہ سایۂ دیوار ہی بہت ہے تب مَیں دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ بید کی شاخیں ہَوا سے ہلنے لگیں اور نازک نوکیلے پتوں کی سرسراہٹ سرگوشیاں کرنے لگی۔

اے ابی وقاص! اللہ راضی تجھ سے میں ترے سکون میں مخل ہوتا ہوں درگزر کرنا۔ دل سے کہنا۔ وہ جس کے سر پر بادل سایہ کیے چلتا تھا۔ وہ قصویٰ اونٹنی کا سوار جس کے عشاق حسینوں سے خوشتر و زیبا تر و محبوب تر ہیں دِل جسکے عشق سے توانا اور خاک ہمدوش ثریا ہوتی ہے۔ وہ جو دل کا مکین اور میری تمھاری آبرو جس کے نام سے ہے۔ اور موجِ غبار

جس کے گھر کی ہے شفاف جلوۂ طور سے۔ وہ شبستانِ حرا کا تنہا۔۔ قوم و آئین وحکومت کی طرح ڈالنے والا جس کی تلوار جنگ میں لوہا موم کرتی اور آنکھ پُرنم ہوتی تھی نماز میں ۔۔۔ جو دُعائے نصرت کرتا تو تلوار آئین کہتی پادشاہی کی نسلیں کاٹتی تھی۔ جو نسخۂ کونین کا دیباچہ اور تمام عالم غلام جس کا اور وہ آقاؐ، جو نگاہ عشق و مستی میں اوّل بھی آخر بھی جو قرآن بھی فرقان بھی اور یٰسینؐ اور طٰہٰؐ سچے سجیلے نام جس کے۔ وہ جو آیۂ کائنات کا معنئ دیر یاب ہے۔ جو لوح بھی ہے قلم بھی ہے۔ جس کا وجود الکتاب۔

اے ابی وقاصؓ! اللہ راضی تجھ سے پر کتنی دُور آن بسے ہو۔ ریشم و اطلس کی سرزمین پر، حریر و پرنیاں کے دیس میں وہ ریگِ نواحِ کاظمہ کی نرمیاں یاد تو آتی ہوں گی۔ بانس کے تنے لرزے نازک شاخیں تھرتھرائیں اور نوکیلے نرم پتوں کی سرگوشیاں ایک ترتیب میں ڈھل گئیں۔

درود بھیجو درود۔ آمنہ کے لالؐ پر۔ کملی والےؐ پر سلام بھیجو۔۔۔ یہ فاصلے یہ دوریاں یہ ہجر و فراق سب عیشِ دوام میں ڈھل جائیں گے۔

اے اللہ سلامتی دے محمدؐ کو اور اس کی آل کو
تو نے جس طرح سلامتی دی ابراہیمؑ کو اور اس کی آل کو۔
بیشک تو ہی تعریف کے لائق اور بزرگی والا ہے۔

۲۵ نومبر کی صبح تیار ہوکر کھڑکی سے موسم کا حال دیکھا۔ مطلع ابر آلود تھا۔ اور بارش کا امکان تھا۔ ناشتہ کیا۔ کالی چائے چینی دودھ کے ساتھ ایک نعمتِ غیر مترقبہ تھی۔

مادام چنگ نے میرے لیے امریکی ڈالروں کے عوض مقامی کرنسی کا خاص انتظام کیا۔ پھر کامریڈ شان اور مادام چنگ اور کینٹن کی مادام کے ساتھ کینٹن کے ڈیپارٹمنٹل سٹوروں میں گھومے پھرے۔ بارش ہلکی ہلکی ہونے لگی۔ مگر سیر کا لطف دوبالا ہوگیا۔ وہ ایک ہائی نک جرسی جو بیجنگ کے فرینڈشپ سٹور میں اپنے رنگ کی وجہ سے مجھے پسند نہ آئی تھی۔ شینگ ہائی میں اُس کا سائز میرا نہ تھا۔ ہانگچو میں سرے سے ہی ناپید تھی اب کینٹن میں بھی دکھائی نہ دے رہی تھی۔ ناچار ایک خرید لی جیسی بھی تھی۔ کینٹن کے بعض حصّوں میں کراچی کے بعض علاقوں خصوصاً کھارادر ڈنسو ہال وغیرہ کی یاد آتی ہے۔ شاید اِس لیے کہ مچھیروں کی بستی کو جس نے کراچی شہر بنایا وہ لارڈ نیپئر تھا اور کینٹن میں پہلے پہل جس شخص نے تجارتی مراکز کھولے اُس بھلے مانس کا بھی نام لارڈ نیپئر

ہی تھا۔

کینٹن کے بازاروں سے چینی موقلم اور کاغذ خریدا۔ ایک بنک میں بھی جانے کا اتفاق ہُوا۔ ماحول اندر سے ہماری گوالمنڈی، چونا منڈی اور اکبری منڈی کے بنکوں سے مختلف نہ تھا مگر کارکردگی کہیں زیادہ بہتر تھی۔ ایک دو پارک دیکھے اور دریائے پرل کی سیر کی جو کینٹن شہر کو دو حصّوں میں تقسیم کرتا بہتا ہے۔ دریا پار سن یات سن یونیورسٹی ہے۔ جسے ڈاکٹر سن یات سن نے ۱۹۲۴ء میں قائم کیا اور جسے دیکھنے کی حسرت ہی رہ گئی۔

تن فینگ میں واپس آئے۔ لنچ کیا اور کینٹن ائرپورٹ پہنچ گئے۔ افواہ گرم تھی کہ پرواز میں تاخیر واقع ہو گی۔ کامریڈ شان پتہ کر کے آیا اور بولا۔

"گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ طیارے کی آمد میں قدرے تاخیر واقع ہونے کی وجہ ظاہر نہیں ہے۔ ہمیں روشن اُمید ہے کہ ابھی چند لمحوں بعد فضا میں طیارہ نمودار ہو گا اور آہستہ آہستہ پرواز کرتا ہُوا زمین پر اُتر آئے گا۔"

پھر طیارہ نمودار ہُوا اور آہستہ آہستہ اُتر کر واقعی آ گیا اور مقررہ وقت پر زمین پر دوڑنے لگا۔ پورے ۲ بجے ٹیک آف کر گیا۔ جہاز میں بھانت بھانت کے لوگ تو نہیں البتہ بھانت بھانت کے چینی لڑکے لڑکیاں بوڑھے نوجوان سب تھے۔ کچھ جاپانی ولایتی بھی تھے۔ بادلوں کا سمندر جہاز کی کھڑکی سے دکھائی دیتا ہے اور اندر جہاز کے رنگ برنگے چینی جو جہاز کے مسافر تھے تو یقینی طور پر متمول ہوں گے۔ عورتیں اور مرد اپنے اپنے طور پر بہترین اور جدید لباسوں میں تھے۔ مگر نہ جانے کیوں اُن سب کے لباس لنڈے بازار کے لگتے تھے۔ شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ چینیوں کو آنکھیں ایک ہی لباس میں دیکھنے کی عادی ہو چکی تھیں اور اس سے بھی زیادہ قوی

وجہ یہ تھی شاید کہ اس پرواز میں دونوں ائر ہوسٹس نیوی بلیو پلینٹ جیکٹ پتلون ماڈ کیپ اور پیلے سکارف میں سُرخ وسفید تو تھیں مگر قدآور بھی تھیں اور چین میں لڑکی کا قد آور ہونا بہت نشہ آور ہوتا ہے۔ مَیں نے کامریڈ لِن سے پوچھا۔ تم کامریڈ لوگ کیسی لڑکیاں پسند کرتے ہو؟

کامریڈ لِن حد درجہ سنجیدہ انسان تھا۔ پورے دَورے میں ہمارے ساتھ تھا پہلی بار اُس کے چہرے پر رومانٹک مسکراہٹ پھیلی اور وہ مجھے آنکھ مار کر بولا۔ "پسند تو سب کو ایسی ہی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ سب کو ایسی پر کہاں سے ملتی ہیں۔"

اتنے میں ائر ہوسٹس ایک ٹوتھ برش اور ننھی سی ٹوتھ پیسٹ کا تحفہ دے گئی۔ جسے کامریڈ لِن نے وصول کر کے مخمور آنکھوں سے اُسے دیکھا اور شے شے کیا۔

اب باہر بادلوں کی سرزمین پر تازہ تازہ روشیں بن گئی ہیں۔ جیسے کسی مشتاق دہقان نے ابھی ابھی ہل چلایا تھا۔ خدا جانے اس کھیتی میں کون سے ستارے بوئے جائیں گے اور کس فصل کی کہکشاں اُگے گی۔

اتنے میں دوسری ائر ہوسٹس نے کھانے کی ٹرے ہمارے سامنے سجا دی۔ ایک دم بھوک چمک اُٹھی نہ جانے کیوں۔ چھری کانٹا اُٹھایا پھر خیال آیا حبیب الرحمٰن کا جس کی طرف دیکھا اُس نے خلافِ معمول متانت سے کہا۔ خوب صورت لڑکی خنزیر کھلانا چاہتی ہے۔

اِتنے میں کامریڈ لِن اپنی پلیٹ میں سے آدھے سے زیادہ سؤر ہڑپ کر چکا تھا۔ مَیں نے اپنی ایک پلیٹ بھی اُس کی طرف بڑھائی، جو اس نے تیزی سے اُچک لی۔ جیب سے پولیتھین کا لفافہ نکالا۔ اس میں سؤر ڈالا

اور اپنے کوٹ کی جیب میں بھر لیا۔ ہم نے بل دی۔ ہوسٹس آئی تو حبیب الرحمٰن نے اُسے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ وہ محجوب سی ہو کر ٹرے اُٹھالے گئی پھر کچھ دیر بعد ٹرے میں کیک پیس، پیسٹری، سلائس، مکھن، کیلے اور سیب لے آئی۔

مَیں نے حبیب الرحمٰن سے پوچھا۔

کیک پیسٹری میں کچھوے اور سانپ وغیرہ کا امکان تو نہیں ، نکل آئے تو مادام چنگ کو دے دینا۔ حبیب الرحمٰن نے مشورہ دیا۔ نہ جانے بھوک ایک دم کدھر سے آئی تھی اور سؤر کو دیکھ کر پھر کدھر نکل گئی کیلے اور سیب نے خوب مزا دیا۔

کامریڈ لن نے پوچھا۔" آپ لوگ پھل بہت پسند کرتے ہیں"۔

" ہاں ہمارا گزارا پھلوں پر ہے"۔ مَیں نے جواب دیا۔

باہر سورج کی کرنیں بادلوں کے اُفق پر توسِ قزح بنا رہی ہیں۔اور جب بادلوں کے صحرا میں سورج غروب ہو رہا تھا۔ جہانِ آب و گِل میں عصر کا وقت ہوگا۔

ساڑھے چھ بجے شام بیجنگ کے ہوائی اڈے پر اُترے۔

بیجنگ میں برفباری گزشتہ دو دن سے جاری تھی۔ سخت سردی اور ہاتھ کان ناک جھاڑنے والی سرد ہوا چل رہی تھی۔ ایک گھنٹہ کار آہستہ آہستہ چلتی رہی اور مس چن جو ہمیں ائرپورٹ لینے آئی تھی۔ میرے سفر کے بارے میں پوچھتی رہی۔ پھر منزو Minzu ہوٹل پہنچے اور کمرہ نمبر ۸۶۱ میں رین بسیرا ٹھہرا۔

۹ بجے رات مختار احمد کا فون آیا ہے کہ وہ پندرہ منٹ میں پہنچ رہا

ہے۔ اتنے میں مَیں نے کھانا کھا لیا۔ وہ پندرہ بیس منٹ میں پہنچ گیا۔باہر برفباری زوروں پر تھی۔ مگراُس نے جب گھر پر بنی ہوئی پاکستانی چائے کا لالچ دیا تو مَیں فوراً تیار ہوکر ساتھ چل دیا۔ ٹیکسی میں ۱۰ منٹ کا راستہ ہے اُس کے گھر تک۔ بیگم مختار احمد نے شاندار چائے پلائی اور کہا کہ کم ازکم تین کپ پیئوں۔ مختار کے بیٹے سے باتیں کیں۔ جو بڑا ذہین اور پیارا بچہ ہے۔

مختار احمد اردو کا مشہور افسانہ نگار ریڈیو کی اُردو سروس میں ہے اور چین بانصویر سے بھی منسلک ہے۔ بے حد ملنسار اور پڑھا لکھا انسان، درویش منش، اعلیٰ ظرف اور ان اوصاف کی وجہ سے وطن سے دُور رہنے پر مجبور دلیسے وہاں کافی خوش ہے۔ کام لگن سے کرتا ہے اور وہاں اسے کام کرنے دیا جاتا ہے۔ چین سے سوتا ہے کہ کام کے عادی شخص پر نیند مہربان ہوتی ہے۔ سردی کے ساتھ رات بھی زیادہ ہورہی تھی۔ مختار نے ٹیکسی سٹینڈ پر فون کیا مگر کافی دیر تک ٹیکسی نہ آئی ہم دونوں پیدل مارچ کرتے برفباری کا لُطف لیتے ٹیکسی سٹینڈ تک آئے وہاں سے ٹیکسی لی اور مختار مجھے ہوٹل چھوڑ کر صبح ملنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ مَیں نے لباس تبدیل کیا۔ کمرہ کافی گرم تھا۔ کھڑکی کھولی کہ برفباری کچھ دیر تک دیکھوں مگر باہر ہَوا آندھی میں تبدیل ہورہی تھی۔ مَیں نے مس لِن سے فون پر پوچھا کہ محکمہ موسمیات کی کیا پیش گوئی ہے کل کے بارے میں۔ تو اُس نے بتایا کہ صبح تک برفباری بند ہو جائے گی۔ دھوپ ہوگی البتہ ہَوا بدستور چلے گی۔

۲۳

۲۶ر نومبر کی صُبح گرم پانی کے غسل سے بدن تر و تازہ ہو گیا۔ تیار ہوکر کھڑکی کھولی تو حیرت ہوئی کہ واقعی برف باری تھم چکی تھی۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی اور ٹھنڈی ہَوا بھی چل رہی تھی۔ اتنی ٹھیک پیش گوئی تھی اہلِ چین کی۔ اگر ہمارا پاکستانی محکمہ موسمیات ایسی پیش گوئی کرے اور وہ ایسی ٹھیک نکلے تو مجھے اُمید ہے لوگ محکمہ موسمیات سے متعلق لوگوں کو اولیاء کے برابر عزّت و تکریم دیں گے۔ تعویذ دھاگے کروائیں گے۔

ناشتہ کرنے کے بعد مس چن مادام چنگ کامریڈ شان اور حبیب الرحمٰن کے ساتھ سمر پیلیس دیکھنے روانہ ہوئے۔ تھوڑی دیر بعد بیجنگ کے بازاروں سے نکل کر مضافات میں ایک نہر کے کنارے کنارے سفر شروع ہُوا۔ یہ نہر بی آر بی کی طرح دونوں کناروں سے پختہ ہے اور کناروں پر کیکر قسم کے درختوں کی قطاریں ہیں اور دونوں جانب کھیت ہیں۔ تقریباً بیس منٹ کے بعد ہم سمر پیلیس پہنچ گئے جو بیجنگ کے شمال مشرق میں واقع ہے۔ گرما میں چینی لوگ یہاں پکنک منانے آتے ہیں اور سرما میں اس پیلس کی جھیل میں برف پر سیکٹنگ کرتے ہیں۔

اِس وقت ٹھنڈی یخ ہَوا چل رہی ہے۔ جھیل کا بیشتر حصّہ منجمد ہے۔ اور جھیل سے باہر اِس عظیم الشان پیلس کے پودوں پر اور گھاس پر جابجا برف دکھائی دیتی ہے۔ عرفِ عام میں یہ منگ خاندان کی ایک بیوہ ملکہ نے گرمیوں کے دن گزارنے کے لیے بنوایا تھا۔ اس سمر پیلس میں اتنے محل اور حویلیاں ہیں کہ گنتی میں نہیں آتی ہیں۔ یہاں مجھے اپنے یار خداداد کا وہ فقرہ شدّت سے یاد آیا جو اُس نے اپنے ایک جسٹس دوست کی بیگم کے اس شکوہ گِلہ پر کہ پاکستان نے انھیں کیا دیا ہے۔ کہا تھا۔ ہاں جی آپ لوگوں کو واقعی اس پاکستان نے کچھ بھی نہیں دیا۔ دیکھیئے نا یہ آپ کی کوٹھی کہ اندر داخل ہوتے چلے جائیں مگر یہ شروع ہونے میں نہیں آتی۔ سمر پیلس بھی دیکھتے جایئے اور چلتے جایئے پھیلتا ہی چلا جاتا ہے۔ سمر پیلس ایک الف لیلوی جگہ ہے۔ نظارہ ہی نظارہ ایک کے بعد ایک نیا انوکھا اور خیال انگیز، مور، شیر، ہاتھی، کچھوا، ہرن، بیل، گھوڑا، اژدھا، اونٹ یہ سب جانور زمانۂ قدیم سے اہلِ چین میں لمبی عمر، عزّت، وقار، طاقت، تقدس کی علامتوں کے طور پر قابلِ احترام سمجھے جاتے ہیں۔ اس محل میں ان جانوروں کے حجری اور دہاتی مجسمے جگہ جگہ آراستہ ہیں۔

ایک کے بعد ایک پیولین ہے۔ جن میں خواب گاہیں، آرام گاہیں اور یقیناً سازشش گاہیں بھی ہیں۔ ایک بیوہ ملکہ کے عیش و آرام کی خاطر یہ سات سو ایکڑ پر محیط ہے۔ اُس ملک میں جہاں لوگ آج بھی ریل کی پٹڑیوں کے قریب چھوٹی چھوٹی جگہوں پر کاشت کر لیتے ہیں۔ زمین کے چپے چپے سے رزق اُگانے کے متمنی اور ایک بھی نوالہ ضائع کرنا نہیں چاہتے۔ اور اس غیر طبقاتی نظام میں آج تک صدیوں کی بھوک کے خوف سے دامن نہیں چھڑا

سکے۔ آج بھی ایک چینی جب دوسرے سے ملتا ہے تو پوچھتا ہے۔

"کھانا کھایا ہے ؟"

مس چن مادام چنگ کا مریڈشان اور حبیب الرحمٰن کے ساتھ اس پیلس کے ایک ریسٹوران میں دوپہر کا کھانا کھایا۔ چینی کھانے کا لطف جو یہاں آیا وہ اور ہی تھا۔ اس کی لذت غیر معمولی تھی۔

سمر پیلس اصل میں دو محل تھے۔ پہلا محل تاتاریوں نے چن دورِ حکومت (۱۲۳۹-۱۱۵۵ء) میں بنایا تھا۔ جہاں اب شنگھوا یونیورسٹی کا عقبی دروازہ ہے۔ یہ چنگ خاندان کے دورِ حکومت کے آخری دنوں تک رہا اور ۱۸۶۰ء میں برطانوی استعمار نے دربار شاہی کو اپنی شرائط پر مجبور کرنے کے لیے دھمکی کے طور پر جلا دیا تھا۔

یہ موجودہ محل کا زیادہ حصہ چنگ بادشاہوں نے کن منگ جھیل کے کنارے بنوایا ہوا ہے۔ شہنشاہ چی این نے پہاڑی پر سفید بادل Pai Yon نامی محل ۱۷۹۱ء میں اپنی ساٹھ سالہ بیوہ ماں کے لیے تعمیر کیا۔ پھر اس میں مزید توسیع ہوئی۔ اور ایک باتصویر گیلری کا عظیم الشان اضافہ کیا۔ یہ گیلری چینی ذوقِ جمال اور پرورش فنِ مصوری کا لافانی ثبوت ہے۔ یہ لکڑی کی بنی ہوئی ایک مسقف راہداری ہے۔ جس کی طوالت دو ہزار تین سو اٹھاسی فٹ ہے اور یہ کن منگ جھیل کے شمالی کنارے کے ساتھ ساتھ چلتی ہے، اس میں ہر سو گز کے فاصلے پر ایک پویلین ہے۔ اِس راہداری میں دائیں بائیں اور اوپر چینی سرزمین کے لینڈ سکیپ پینٹ کیے گئے ہیں۔ فن کے اِن نمونوں کی تعداد کم و بیش ہزاروں میں ہے اور دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس سمر پیلس سے میٹھے خستہ سیب کھاتے نکلے اور سیدھے بیجنگ کا رُخ کیا۔ اور بیجنگ فرینڈشپ سٹور پہنچے۔ بیجنگ میں آج میری آخری شام ہے۔ جو یوآن گرہ میں بچے خرچ بھی تو کرنے تھے۔

فرینڈشپ سٹور میں گھومے پھرے کچھ ٹیپسٹری اور مصوری کے نمونے اور کچھ برتن چینی روایتی طرز کے خریدے۔ یہاں لئیق احمد سے ملاقات ہوئی جو تعلیمی وفد کے ساتھ آج ہی بیجنگ پہنچے تھے۔

اس رات افضل قادر اور ان کی بیگم نے کھانا دیا۔ کوثر کی مصوّری کے نمونے تو میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ انھوں نے پراٹھے، دال، چاول، قیمہ ساگ، مُرغ اور میٹھا جس طرح بنایا اور وہ سب کچھ اتنا لذیذ تھا کہ انگلیاں چاٹیں۔ اعتراف کرنا پڑا کہ وہ ایک اچھی مصورہ ہی نہیں عمدہ کھانا بھی بنانے میں فن کار ہیں۔

۹ بجے رات منزدِ ہوٹل واپس اور مختار احمد سے فون پر گپ شپ۔ وُہ مُجھے ریڈیو بیجنگ کے لیے انٹرویو پر اُبھارتا رہا اور مَیں ٹالتا رہا بالآخر ٹال گیا۔ یہ چین میں آخری رات تھی۔

۲۷ر نومبر کی صبح جلدی جاگ گیا۔ گرم پانی کے ٹب میں دیر تک نہاتا رہا۔ پھر تیار ہو کر نیچے آیا۔ ناشتہ کیا اور حبیب الرحمان فون پر کہہ رہا تھا گیارہ بجے چینی الوداعی کھانا دیں گے اسی ہوٹل میں دو بج کر دس منٹ پر پرواز ہے۔ گویا اتنا وقت میرے پاس تھا۔ تب مَیں نے سوچا کہ پیدل اور چینیوں کی ہمراہی کے بغیر جاتے جاتے چین کی کیا چیز خود دیکھ کر واپس آسکتا ہوں۔ اوورکوٹ پہنا اور ہوٹل سے نکل گیا۔ آہستہ آہستہ ہر شئے دیکھتا فٹ پاتھ پر چلتا رہا۔ یخ ہوا چل رہی ہے۔ مگر منزل دُور نہیں ہے۔ یہ گریٹ ہال ہے سامنے ہسٹری میوزیم اور تیسری جانب تی این من اور اس کے بالمقابل لمبے چوڑے میدان کے پار عوامی ہیروز کی یاد اور اس کے عقب میں ماؤ میموریل ہال ـــــ مَیں اندر داخل ہوا اور مسکراتے آرام سے پُروقار بیٹھے ماؤ کے سفید فام مجسمے سے گزر کر عقبی ہال میں ماؤ کو سکون سے سیدھے لیٹے سُرخ کمبل اوڑھے دیکھتا ہوں، ارد گرد سُرخ للی کے خوبصورت پھول مسکرا رہے ہیں۔ اس ہال سے نکل کر پُرانے بیجنگ کے گرد معدوم۔ ہو چکی دیوار کے واحد موجود گیٹ (کی این من) کی محرابی سرنگ سے گزر کر چند لمحے رُکتا

ہوں مجھے چیئرمین ماؤ کی ایک نظم کی ایک لائن یاد آتی ہے۔"سرزمین چین کے یہ ستر کروڑ عوام سارے کے سارے دلی ہیں۔ یہ ویرانوں کو شہروں میں اور صحراؤں کو کھیتوں میں بدل سکتے ہیں۔ یہ جو چاہتے ہیں وہ ہو جاتا ہے۔" پھر ہوٹل کو چلتا ہوں اور کچھ دیر بعد پہنچ جاتا ہوں۔جہاں بیگم مختار احمد میری منتظر ہیں اور پلاسٹک کے پھلوں کا تحفہ لے کر آئی ہیں۔

پھر مختار احمد سے ٹیلیفون پر الوداع کہی اور مادام چنگ، مس چنگ کامریڈ شان ، کامریڈ لن اور حبیب الرحمٰن پہنچ گئے۔ مل کر کھانا کھایا پھر ایئرپورٹ کو روانہ ہوئے۔ ایئرپورٹ پر افضل قادر بھی ہیں۔ سب سے ملے اور دو بج کر ۱۰ منٹ پر طیارہ ہوا میں بلند ہو گیا۔ اور میں بلند ہونے کے ساتھ ساتھ چینی زمین پر آخری نظر ڈال رہا ہوں۔ محنت کشوں ، کاریگروں ، ہنرمندوں اور سچے لوگوں کی زمین ـــــ کھیتوں ، کھلیانوں اور دہقانوں کی سرزمین ـــــ خود احتسابی کا نیر دل میں پیوست کر دینے والا خطۂ چین ـــــ

السلام علیکم ۔ خواتین و حضرات جہاز کا کیپٹن آپ سے مخاطب ہے۔ ہم آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ ہم چھتیس ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرتے ہوئے انشاء اللہ ساڑھے چھ گھنٹے میں اسلام آباد کے انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر اتریں گے۔ امید ہے آپ کا یہ سفر خوشگوار گزرے گا۔

جہاز میں کل بیس پچیس مسافر ہیں ۔ پی آئی اے کے عملہ کے علاوہ میں واحد پاکستانی تھا۔ باقی سارے مغربی ممالک کے سفید فام لوگ ۔ جن میں زیادہ تر بوڑھی عورتیں اور مرد ایک دو جوان عورتیں بھی ۔ جن میں سے ایک جینز میں کسی ہوئی ایک بچے کی ماں بھی ہے ۔ جس کا بچہ ایک بیڑی

سے چلنے والی کھلونا کار سے کھیلتا ہُوا سارے جہاز میں سیٹوں کے نیچے اِدھر اُدھر پھرتا ہے۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اُٹھ کر آگے پیچھے جا کر اُسے تلاش کرکے اپنے قریب لاتی ہے اور پھر بچہ اپنے کھیل میں اِدھر اُدھر ہو جاتا ہے۔ اس جہاز میں کُل ائر ہوسٹس دو ہیں۔ ایک تو دلربائی کی سرحدوں سے اتنی دُور جا چکی ہے کہ شاید میک اَپ سے بھی مایوس ہو چکی ہے اور دوسری یوں لگتی ہے۔ جیسے گزشتہ کئی دنوں سے صرف میک اَپ ہی کرتی رہی ہے۔ سچ ہے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت ہوتا ہے۔

طیارہ بلندی مکمّل کرکے ہموار ہو چکا ہے۔ مَیں کھڑکی سے دیکھتا ہوں۔ پھر سگریٹ سلگاتا ہوں اور اپنے سامنے دُنیا کا نقشہ پھیلا لیتا ہوں۔ خطۂ چین پر اُن مقامات کو دیکھتا ہوں جو اس سفر میں میری نظر سے گزرے۔ بیجنگ سے شینگ ہائی، شینگ ہائی سے کینٹن اور کینٹن سے بیجنگ واپس۔ ان مقامات کو اگر خطِ مستقیم سے ملا دیا جائے تو کینٹن سے بیجنگ والے خط پر کینٹن سے شینگ ہائی اور بیجنگ سے شینگ ہائی تک خطوط کینٹن اور بیجنگ کے نقطوں پر برابر برابر زاویے بناتے ہیں۔ اس طرح شینگ ہائی کینٹن اور شینگ ہائی بیجنگ والے خطوط بھی اپنی لمبائی میں تقریباً یکساں ہیں۔ یوں وہ علاقہ جو مَیں نے دیکھا چین کے مشرقی ساحل پر ایک مساوی الساقین مثلث کی شکل بناتا ہے۔ اور اس مثلث کا رقبہ چین کے کُل رقبے کا کم و بیش بیسواں حصّہ ہے۔ یہ مساوی الساقین مثلث بیجنگ سے کینٹن والے عموداً خط پر بن رہی ہے۔ علم ہندسہ کی یہ شکل مجھے خاص پسند ہے۔ میرے دائیں ہاتھ میں یہ شکل عام ہے۔ خطِ کمال میں اس کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یہ ہمیشہ سے میرے لیے اتنی خیال انگیز

رہی ہے۔ جتنے مصر کے اہرام۔ باہر کا منظر بادلوں کی گہری تہ کے نیچے ہے اور اندر جہاز کا منظر سیاحت سے واپسی پر تھکے ہوئے چہروں کا منظر ہے۔ اِس لیے مَیں مثلث پر اپنی دلچسپی مرکوز رکھنے پر مجبور ہوں۔ مثلث کے تین زاویوں کے حوالے سے مَیں نے چینی قوم میں جو کچھ دیکھا چشمِ تصوّر میں لایا تو سائیکل، لباس اور زبان تین نقطے بڑے ٹھوس بڑے واضح دکھائی دیتے ہیں۔

ایئر ہوسٹس چائے اور ہلکا سامانِ خورد پیش کر گئی ہے۔ مَیں چائے کا گھونٹ لیتا ہوں اور نقشے پر بیجنگ سے ۴۰ ڈگری عرض بلد کو مغرب کی طرف سفر کرتا غور سے دیکھتا ہوں۔ جو روس میں سمر قند اور بخارا کے سر پر سے گزرتا کیسپین کو عبور کرکے ترکی کے دارالحکومت انقرہ سے جا ملا ہے۔ میری دلچسپی اور بڑھتی ہے۔ مَیں دیکھتا ہوں ۳۰ ڈگری عرض بلد جاپان کے نچلے ساحل سے آتا ہوا شینگ ہائی کے پاس سے گزرتا ہے۔ مَیں ۳۰ ڈگری عرض بلد کا تعاقب کرتا ہوں۔ جو قراقرم عبور کرکے لاہور کے پاس سے گزرتا ہے۔ جہاں مغرب کے جواب میں پیامِ مشرق میرے مرشد نے لکھی۔ لاہور سے گزر کر ۳۰ ڈگری عرض بلد افغانستان سے گزرتا ہے اور عرض بلد پر جتنے فاصلے پر شینگ ہائی اور لاہور واقع ہیں۔ اُسی فاصلے اور اسی سمت پر قندھار ہے۔ جہاں محرابِ گل افغان کی للکار گونجتی ہے۔ راستہ روک لیتی ہے۔

افغانی باقی! کہسار باقی!

اب میری نگاہ ۳۰ ڈگری سے ۲۰ ڈگری عرض بلد کی طرف جاتے جاتے ایک سُرخ لکیر پر رُک جاتی ہے۔ یہ خطِ سرطان ہے جو کینٹن سے گزر رہا ہے۔

اور برما، بنگلہ دیش، بھارت سے گزرتا بھارت اور پاکستان کو بمبئی اور کراچی کے درمیان سے کاٹتا بحیرہ عرب میں خلیج کے دہانے سے گزرتا اومان سے جاتا سعودی عربیہ میں داخل ہو کر اُس شہر میں مجھے چھوڑ جاتا ہے جو کبھی بیماریوں کا شہر یعنی یثرب کہلاتا تھا۔ پر چودہ صدیوں سے اب تک خاک اُس شہر کی اکسیر ہے۔ آنکھ کا سُرمہ ہے اور آشفتہ سردل کی دستار ہے۔

"خواتین وحضرات! جہاز کا کپتان آپ سے مخاطب ہے۔اس وقت ہم چین کے صُوبہ سنکیانگ کے دارالحکومت اورمچی پر سے پرواز کر رہے ہیں شکریہ۔"

میں نیچے دیکھتا ہوں۔ بادلوں نے بھی نگاہ کو زمین تک راستہ دے دیا ہے۔ مگر اورمچی شہر اور اُس کے گردو نواح میں اتنی بلندی سے کوئی بھی شئے قابلِ شناخت نہیں ہے۔ البتہ جو بھی زمینی منظر ہے۔ ایک ہلکی ہلکی مہک اُس کی اس بلندی تک پہنچ رہی ہے۔ اہلِ چین ابھی جفاکشی کے پسینے میں شرابور ہیں۔ ابھی اقلیم انبساط میں داخل ہوں کے اور سرخوشی کی ہُوا چلے گی تو قلوب میں رَدِعمل کی لہر ضرور اُٹھے گی۔

خواتین وحضرات! نیچے برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں میں گہری لکیر شاہراہ ریشم ہے اور بائیں جانب تقریباً ۵۰ میل کے فاصلے پر دُنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی کے ٹو آپ دیکھ سکتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ہم چین سے نکل کر پاکستان میں داخل ہو چکے ہیں۔ شکریہ۔

شام ہو رہی ہے۔ بادلوں کی تہیں اور گہری ہو رہی ہیں۔ میں پھر نقشہ پر تکون کا مطالعہ کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ مثلث کا نقطۂ اُبھار

چین کے مشرقی ساحل پر یعنی شینگ ہائی ہے۔ پھر سمندر ہے۔ لہٰذا اس نقطۂ ابھار سے مثلث کی دو مساوی ٹانگوں کو لمبا کر کے دیکھنا چاہیئے اور مَیں شینگ ہائی سے بیجنگ والے خط کو آگے بڑھاتا ہوں، جو منگولیا کو کاٹتا ہُوا روس میں داخل ہو کر سائبیریا میں ٹھٹھرتا ہُوا بالآخر بحرِ منجمد شمالی میں اُتر جاتا ہے۔ پھر مَیں شینگ ہائی سے کینٹن والے خط کو لمبا کرتا ہوں تو وہ لاؤس، تھائی لینڈ اور کمبوڈیا اور بنکاک سے گزرتا بحرِ ہند میں اُتر جاتا ہے۔

اگر ان دو خطوط کو ٹانگوں کی بجائے بازو کہہ لیں۔ تو ان دو پھیلے ہُوئے بازوؤں کے زاویہ میں سارا کرۂ ارض سما جاتا ہے۔

"خواتین و حضرات! آپ اپنی بائیں جانب تقریباً ۶۰ میل کے فاصلے پر چوتھی بلند ترین چوٹی نانگا پربت دیکھ سکتے ہیں۔ شکریہ۔"

نانگا پربت کی طرف بادل تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ جیسے اُسے آغوش میں لینے کو بیقرار ہوں اور میں دو خطوں کی آغوش میں سماتی ہوئی زمین پر اس صدی میں کوئی مشترک بات تلاش کرنا چاہتا ہوں۔ پھر نانگا پربت کو دیکھتا ہوں بادلوں نے اُسے بالکل ڈھانپ لیا ہے۔

"خواتین و حضرات آپ اپنی دائیں جانب نیچے راکا پوشی کو بادلوں کی وجہ سے دیکھ نہیں سکتے۔ اندھیرا زیادہ ہو گیا ہے شکریہ۔"

کے ٹو ــــ نانگا پربت ــــ راکا پوشی ــــ گویا ہم اس وقت دُنیا کی بلندیوں پر سے پرواز کر رہے ہیں اور تین چوٹیوں کے حوالے سے میرے ذہن میں تین نقطے مثلث کے پھر روشن ہو گئے۔ مَیں نے ایک نقطے پر جذبہ رکھا۔ دوسرے پر فعل رکھا اور تیسرے پر فکر، کہیں یہ فکر تھا۔ جذبہ نہ تھا۔ کہیں جذبہ تھا تو عمل نہ تھا اور عمل تھا تو فکر نہ تھا۔ گویا ہاتھ دل اور ذہن

میں اشتراکِ کار کا فقدان ہے۔ اس سانحہ کے باوجود ایک ہی حرف سے شروع ہونے والے تین نام مارکس، ماؤ اور مودودی ذہن میں روشن ہوئے۔
تو کسی نے میرے دل میں کہا۔
یہ سب فروغِ اسمِ محمدؐ ہے۔
تو پھر ہاتھ دل اور دماغ میں عدم اشتراک کا سانحہ کیا ہے؟
مَیں نے پوچھا۔
ابھی یہ جلوے تمام کے تمام نامِ نامی اسمِ گرامی محمدؐ کی 'م' اوّل کے ہیں، اور یہ رنگ و بو کا قافلہ ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰؐ است تب کتنی ہی ملکوتی آوازیں میری سماعت میں اُتر آئیں اور مَیں کُن فیکون کی صدائے دمادم سے آشنا ہُوا کہ یہ کائنات ابھی نامتام ہے شاید۔
"خواتین و حضرات! آپ اپنی گھڑیوں میں وقت ٹھیک کرلیں۔ پاکستان میں شام کے ساڑھے پانچ ہیں۔ مَیں نے اپنی گھڑی میں جہاں چین کے ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ وقت تین گھنٹے پیچھے کرلیا۔ اپنا وقت تین چوٹیوں کی اوٹ میں تین نسلیں پیچھے کرلیا۔"
خواتین و حضرات! ابھی کچھ دیر میں ہم اسلام آباد کے انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر اُترنے والے ہیں۔ حفاظتی بند باندھ لیجئے۔ سگریٹ بُجھا دیجئے۔ شکریہ!
جہاز بلندی کم کرنے لگا تو مَیں نے باہر دیکھا۔ بادلوں کے اوپر گھرا نیلا آسمان اُس میں ایک جھلمل کرتا بڑا سا شوخ ستارہ دیکھا تو یاد آیا کہ پورے دورۂ چین میں ہم نے آسمان کی جانب دیکھا ہی نہیں اللہ اللہ کیا زمین تھی کہ اُس پر آسمان ہی نہ تھا۔
لیکن آسمان بہت ضروری ہے۔

ورنہ انسان زمین پر چلتے چلتے راستہ بھول جاتا ہے۔

میرے دل میں کوئی کہہ رہا تھا۔

قطب نما اصل نہیں ——— قطبی ستارہ اصل ہے۔ جنھیں اپنی صبح یاد نہ اپنی شام یاد رہی وہ گردشِ صبح و شام میں گُم ہوئے مانند اُس ورق کے بے شک جو نقشۂ چاہِ حیواں تھا۔ پر کتاب سے نکلا۔ ہوائیں لے اڑیں۔

مجھے اپنا قطبی ستارا یاد ہے۔ جو چراغ بن کر مرے طاقِ دل میں جلے تو ستارۂ شب، جب پلید و سیاہ سمندروں کی موجیں اپنے اصل کو لوٹ جائیں تو ستارۂ سحر بھی ہے۔

یہی ستارہ قلبِ اعداء پر مرتکز کرتا ہے، تیر جرّی بہادروں کے ——— یہی ستارۂ شام بھی ہے۔ ہمیشہ جس کے نواح میں تلاش کی میں نے ہلالِ عید کی ——— یہ ہلالِ عید جو خنجرِ ہلاکت ہے۔ ان کے لیے جو روشنی سے چہرہ پھیرتے ہیں، ہدایت کو دلوں کے دَر سے دھتکارتے اور ظلم کرنے والے ہیں۔ جن کی شکست میری فتح ——— میں ازل کا فتح مند ——— چاند رُخ ——— ستارہ سمت یہ میری جانماز سر سبز سفید، اُجلی اُجلی، نکھری نکھری، افق تا بہ افق۔